قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

قیمت فی پرچہ
۴
چار روپے

ٹیلیفون

خط و کتابت
ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ۲۵ بی گلبرگ۲ لاہور

بدلِ اشتراک
سالانہ
پاکستان ــــــ ۴۸ روپے
غیر ممالک ــــــ ۱۱۰ روپے

جلد (۴۰) | جون ۱۹۸۷ء | نمبر ۶

فہرست

۱۔ لمعات ۲

۲۔ صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تابِ جاودانہ! ۶
(اے۔ کے۔ سرودی۔ یوگنڈا)

۳۔ عورت بحیثیت انسان۔ (خالدہ) ۲۰

۴۔ نظامِ حکومت۔ (ڈاکٹر صلاح الدین اکبر) ۲۵

۵۔ پیکرِ استکبار کی فسوں سازیاں۔ (حسن عباس رضوی) ۳۲

۶۔ ملک میں پھیلی ہوئی لاقانونیت کا تجزیہ
قرآنِ کریم کی روشنی میں۔ (عبداللہ ثانی ایڈووکیٹ) ۴۱

۷۔ دین و دنیا لازم و ملزوم ہیں۔ (ثریا عندلیب) ۴۸

۸۔ حقائق و عبر ۵۲
۱۔ شریعت بل اور علماء۔
۲۔ فرقہ اہل حدیث اور غائبانہ نمازِ جنازہ۔
۳۔ جماعتِ اسلامی کی نئی معاشی پالیسی۔
۴۔ مساجد اور علماء۔

۹۔ قرآنی اقدار و قوانین اور ہماری زندگی۔ ۵۸
(ثریا عندلیب)

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: شیخ عبدالحمید۔ مقامِ اشاعت: ۲۵/بی، گلبرگ۲ لاہور۔ مطبوعہ: النور پرنٹرز، ۴/۲ فیصل نگر۔ ملتان روڈ۔ لاہور۲۵۔

لمعات

قرآنی علوم کے شہرۂ آفاق سکالر محترم غلام احمد پرویزؒ کے انتقال پرملال کے بعد تحریک طلوعِ اسلام کے اندر جو بظاہر خلا پیدا ہو گیا تھا۔ اُس کو پُر کرنے کے لیے پرویزؒ صاحب کے رفقا کے سامنے ایک چیلنج مرحلہ آگیا۔ کہ کس طرح اس مشن کو آگے بڑھایا جائے۔ جو اُن کی زندگی کا مقصود تھا۔ چنانچہ اُن کے مشن کو زندہ اور متحرک رکھنے کے لیے اور اُس کے دوام کا بندوبست کرنے کے لیے اُن کے رفقا سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ اور باہمی مشاورت سے اِدارہ طلوعِ اسلام کی تشکیل نو طلوعِ اسلام ٹرسٹ اور پرویز میموریل لائبریری کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن یہ سب کچھ جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ جس کے لیے تائیدِ خداوندی کی ضرورت تھی چنانچہ اس سلسلہ میں عزم و استقلال کی ایک زندہ جاوید حقیقت ہمارے سامنے آگئی۔ جس کا تذکرہ کئے بغیر آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔

جنگ بدر حق و باطل کا پہلا معرکہ تھا۔ دونوں جماعتیں آمنے سامنے صف آرا ہیں۔ ایک طرف طاغوتی قوتیں اپنی پوری شوکت و شدت کے ساتھ آمادہ پیکار ہیں۔ دوسری طرف خدا پرستوں کی یہ مختصر سی جماعت جو ۳۱۳ نفوس پر مشتمل ہے، بے سازو یراق حق و صداقت کی مدافعت و حفاظت کے لیے سربکف سامنے کھڑی ہے۔ ظاہر ہے، کہ آج کا معرکہ انسانیت کی تاریخ میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کرنے والا ہے۔ معاملہ کی نزاکت اور اس واقعۂ عظیمہ کی اہمیت کے احساس سے نبی اکرمؐ کا یہ عالم تھا، کہ فوجیں میدان میں ہیں۔ اور حضورؐ اس خدائے ناصر و معین کی بارگاہ عالیہ میں جھولی پھیلائے ہوئے کھڑے ہیں۔ جس کے قانون کی رفاقت و تائید کے بغیر زندگی کے کسی گوشے میں بھی کامیابی و کامرانی نصیب نہیں ہو سکتی۔ جھولی پھیلائی ہوئی ہے۔ اور محویت کا یہ عالم ہے کہ ردائے مبارک کندھوں سے گر گر پڑتی ہے۔ اور آپ کو خبر تک نہیں ہوتی۔ اسی والہانہ جذب و انہماک سے بحضور رب العزت عرض کرتے ہیں کہ :-

بارِ الٰہا! اگر یہ مٹھی بھر جماعت آج مٹ گئی، تو پھر قیامت تک تیری عبودیت اختیار کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔

مانگنے والے نے اس الحاح و زاری سے مانگا اور دینے والے نے اس بذلِ کریمانہ اور ترحم خسروانہ سے

نوازا اور کہا کہ

فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِیْنَ ۝ (۸:۹)

"ہم نے تمہاری بات سن لی ہے۔ تم گھبراؤ نہیں (اگر دشمن کا لشکر ایک ہزار پر مشتمل ہے تو) ہم تمہاری مدد ایک ہزار ملائکہ سے کریں گے۔ جو مسلسل آئیں گے (یوں کائناتی قوتیں تمہاری مدد کرینگی)"

یہ ملائکہ کیا کریں گے؟ کیا مسلمانوں سے یہ کہیں گے کہ تم جاؤ۔ آرام سے گھروں میں بیٹھو۔ ہم ان دشمنوں سے خود ہی نپٹ لیں گے؟ نہیں، خدا کی نصرت اس طرح نہیں آیا کرتی۔ اس کی نصرت دلوں میں طمانیت و یقین کی بہار آفرین جنتیں بسا دیتی ہے۔ اور دلوں کی حالت بدل جانے سے خارجی دنیا از خود بدل جایا کرتی ہے۔ اس طرح سترہ رمضان المبارک ۲ھ، بمطابق ۱۳ مارچ ۶۲۴ء کو طاغوتی لشکر کو شکستِ فاش ہوئی۔ اور باطل سرنگوں ہوگیا۔ آج کثرت و قلت کے پیمانے بدل گئے۔ قرآن کی رو سے میدانِ جنگ میں جس چیز پر فتح و شکست کا مدار ہے وہ سپاہی کا جذبہ ایمان ہے، کثرتِ افواج نہیں۔ اسی جذبہ ایمانی کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (۳:۱۲۳)

(کیا یہ حقیقت نہیں) کہ دشمن کے مقابلہ میں، تعداد کے لحاظ سے کم ہونے کے باوجود جنگ بدر میں اللہ نے کس طرح تمہاری مدد کی (۸/۹) یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ ایک قلیل جماعت اس طرح کامیاب ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ نتیجہ تھا تمہاری استقامت اور تقویٰ کا اسلیئے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تمہیں تقویٰ شعار رہنا چاہیے (یعنی قوانینِ خداوندی کی پوری پوری نگہداشت کرنی چاہیئے) تاکہ تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کریں۔

اپنی کوتاہ دامنی کے پیشِ نظر طلوع اسلام نے بھی آغازِ کار میں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی میں ذات خداوندی پر مکمل بھروسہ کرتے ہوئے آغازِ کار کیا۔ اور خدائے عزوجل کے اس وعدہ پر یقین کامل رکھتے ہوئے کہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝ (۴۷:۷)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! یہ ہمارا وعدہ ہے کہ اگر تم نے نظامِ خداوندی کے قیام میں خدا کی مدد کی وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے پاؤں جما دے گا۔

تحریک طلوع اسلام کے گنتی کے چند نفوس پر مشتمل کاروانِ صدق و صفا اپنے طے شدہ پروگرام پر عمل پیرا ہوگیا۔ اللہ کی تائید سے ادارہ طلوع اسلام کی تشکیل نو ہوئی، طلوع اسلام ٹرسٹ قائم ہوگیا، ٹرسٹ اور ادارہ طلوع اسلام کے مرکزی دفاتر اور پرویز میموریل لائبریری کے لیے جگہ خرید لی گئی۔ ان مقاصد کے حصول

میں احباب نے جس وارفتگی اور وفورِ جذبات سے متنوع انداز میں تعاون پیش کیا ہے۔ اُسے بالتفصیل سامنے لانا شاید ان احباب کے جذبات کی کَمَا حَقَّہٗ ترجمانی نہ کر سکے۔ اور ان کی طبع حساس پر گراں بھی گزرے۔ لیکن بصد معذرت ہم اُسے ضبطِ تحریر میں لائے بغیر نہیں رہ سکتے، کہ ہمارے نزدیک ایسا نہ کرنا ناسپاس گزاری ہوگا۔ یہاں یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ اتنے بڑے متنوع پراجیکٹ پر کامیابی سے ہمکنار ہونے پر۔

عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

وہ اس لیے کہ ایسی اسکیمیں بے پناہ سرمایہ کے بغیر کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتیں۔ لیکن پاکستان کی سرزمین پر طلوع اسلام ایک زندہ مثال ہے۔ کہ اس نے آج تک اپنی خدمات کے صلہ میں کسی قسم کی کوئی مدد نہ تو حکومت سے اور نہ ہی کسی پرائیویٹ ادارہ سے لی ہے۔ اور یہ نہ ہی کسی ایسی ہی اندرونی یا بیرونی طاقتوں کا شرمندہ احسان ہے۔ کہ یہ دین کو بیچنے کے مترادف ہے۔ ہم نے جو کچھ کیا اپنے ہی وسائل سے کیا اور وہ وسائل ہمارے نیک طینت احباب ہیں۔ ان مراحل میں ہماری بہنوں نے اپنے زیورات اور جمع پونجی، اور ہمارے بھائیوں نے اپنے مکانات فروخت کر کے اس بظاہر ناممکن مہم کو ممکن بنا دیا۔

ہم اس عظیم کامیابی کے لیے بالخصوص نمائندہ بزم طلوع اسلام فریڈرک سٹاڈ محترم محمد بشیر ہٹالوی صاحب اور اُن کے اہلِ کُنبہ، اوسکو بزم کے نمائندہ محترم امجد محمود صاحب اور اُن کے رفقاء، بزم لندن کے نمائندہ محترم ایم ایم فرحت اور اُن کے رفقا، محترم محمد عمر دراز اور احباب کویت، اہل خانہ محترم محمد احمد خان درانی (مرحوم)، محترم عطاالرحمٰن ارائیں اور اُن کے برادر عزیز عبیدالرحمٰن ارائیں، نمائندہ بزم ملتان محترم میاں اقبال سرور اور اُن کے رفقاء، نمائندہ بزم جلالپور چٹاں محترم ڈاکٹر محمد اکرم مرزا اور اہلِ خانہ، نمائندہ بزم فیصل آباد محترم ڈاکٹر محمد حیات ملک اور اُن کے رفقاء اور اُن تمام احباب کا بالعموم تہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ جنہوں نے اس مقصد کے حصول کو ممکن بنانے میں گراں بہا تعاون کیا۔

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں۔

یہ کاروانِ صدق و وفا انشاء اللہ فکرِ قرآنی کی راہنمائی میں پہلے سے کہیں زیادہ انہماک کے ساتھ آگے بڑھتا رہیگا۔

اِن تمام مراحل کو بنیاد مہیا کرنے، یعنی متنِ وثیقہِ وقف (ٹرسٹ) کو آخری شکل دینے میں محترم محمد لطیف چوہدری اور محترم سراج منیر صاحب نے جس جانفشانی اور تدبر و تفکر کا ثبوت دیا، قابل صد ستائش ہے۔

ان مراحل سے فارغ ہونے کے بعد سب سے پہلے مرحلہ کے طور پر، ملک بھر میں پھیلے ہوئے وابستگانِ تحریک طلوع اسلام کو مل بیٹھنے کا موقع فراہم کرنے کے لیے، گیارہ سال کے طویل وقفہ کے بعد طلوع اسلام کنونشن کا انعقاد ہوا۔ امسال اس کنونشن کو بالارادہ حلقہء طلوع اسلام کے احباب تک

محدود رکھا گیا تھا۔ تاہم جویانِ حق کی حاضری پہلے سے کہیں زیادہ تھی جو اس کا ثبوت دے رہی تھی کہ:-

رہیں نہ رندیہ زاہد کے بس کی بات نہیں تمام شہر ہے دو، چار، دس کی بات نہیں

چنانچہ پرویزؒ صاحب کی روشن کی ہوئی شمعِ قرآنی کے پروانوں کی اس اجتماع میں شرکت کے لیے آمد اور پروگراموں میں حصہ لینے کا انداز یہ بتا رہا تھا کہ پرویزؒ صاحب کی یہ پکار کہ

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں۔ یہاں اب میرے رازداں اور بھی ہیں

ایک حقیقتِ ثابتہ بن چکی ہے اور یہ قرآنی قافلہ اس بات کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے۔ کہ آج خدا کی اس وسیع زمین پر قرآنِ خالص کی آواز بلند کرنے کی سعادت اس کے حصہ میں آئی ہے۔ آج نہیں تو کل دنیا دیکھے گی کہ

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اور انشاء اللہ العزیز ایک دن انہی کوششوں کے نتیجہ میں:-

اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا

یہ زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے گی۔

رابطۂ باہمی

(۱) نمائندہ بزمِ طلوع اسلام لندن کی اطلاع کے مطابق بزمِ طلوع اسلام لندن ۳۰۔ اگست 1987ء بروز اتوار، ایک روزہ یورپی کنونشن کا اہتمام کر رہی ہے۔ کنونشن میں شرکت کے خواہش مند احباب نمائندہ بزم طلوع اسلام لندن محترم ایم ایم فرحت

76, PARK ROAD, ILFORD, ESSEX. IG1 1SF Tel. 01-533-1896

سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔

(۲) کوپن ہیگن ڈنمارک سے محترم محمد افضل خلجی صاحب نے اطلاع دی ہے کہ کوپن ہیگن میں بزمِ طلوع اسلام کا قیام عمل میں لایا گیا ہے اور محترم محمد اسلم رانا صاحب کو نمائندہ بزم منتخب کیا گیا ہے۔ بصد مسرت اس نئی بزم اور اس کے منتخب نمائندہ کی توثیق کی جاتی ہے۔

ادارہ/ طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

اے۔ کے۔ کے سروری

صِلۂ شہید کیا ہے؟ ۔۔۔ تب و تابِ جاودانہ!

ذیل کا مضمون ہمیں یوگنڈا سے محترم اے۔ کے۔ سروری صاحب نے بھیجا ہے۔ جو پیشِ خدمت قارئین ہے۔ اس مضمون سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے، کہ فکرِ پرویزؒ کے شجرِ طیب کی شاخیں اب کہاں کہاں پھوٹ رہی ہیں۔ اور کیسے کیسے تخمِ صالح پیدا کر رہی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ قرآن کی آواز اپنے اندر اتنی قوت رکھتی ہے۔ کہ خارجی سہاروں کے بغیر اپنے زورِ دروں سے زمانہ میں پھیلتی چلی جائے گی۔ تا آنکہ اشرقتِ الارض بنور ربھا۔

(ادارہ طلوعِ اسلام)

ہمارا مرض اور اس کی دوا

"ہم کو ملحد، زندیق و لامذہب کہنا کچھ تعجب نہیں ہے۔ ہماری قوم نے خدائے واحد ذوالجلال کے سوا، باپ دادا کی رسم و رواج کو اور اپنے قدیمی چال چلن کو دوسرا خدا مانا ہے۔ اور پیغمبرِ آخر الزماں محمدؐ رسول اللہ کے سوا بہت سے پیغمبر پیدا کیے ہیں۔ کتاب اللہ کے سوا، انسانوں کی بنائی ہوئی بہت سی کتابوں کو قرآن بنایا ہے۔ اور ہم ان جھوٹے خدا، فرضی پیغمبروں اور جعلی قرآنوں کو ایسے ہی برباد کرنے والے ہیں۔ جیسے ہمارے جدِّ امجد ابراہیمؑ اپنے باپ دادا کے بتوں کو توڑنے والے تھے۔

ہم سچے خدائے واحد ذوالجلال کا جلال، اور سچے پیغمبر محمدؐ رسول اللہ کی نبوّت اور سچی کتاب اللہ کی اطاعت دنیا میں قائم کرنی چاہتے ہیں پھر وہ لوگ ہم کو ملحد و زندیق و لامذہب نہ کہیں اور نہ سمجھیں تو کیا کہیں اور کیا سمجھیں، ہم ان کے خداؤں، پیغمبروں اور قرآنوں کو نہیں مانتے۔"

(سر سید احمد خاں۔ تہذیب الاخلاق جلد دوم)

"ہماری پوری پوری تعلیم اس وقت ہوگی جبکہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی، ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے، فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس ہمارے بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج ہمارے سروں پر" سرسید احمد خاں

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر — اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں — ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسّر — تاویل سے قرآں کو بنا دیتے ہیں پاژند
کنوئیں میں تو نے یوسف کو گر دیکھا بھی تو کیا دیکھا — ارے ظالم جو مطلق تھا مقیّد کر دیا تو نے
گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن

مقام خویش اگر خواہی در ایں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ رَو

اقبال

"وہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں؟ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی مملکت کی عمارت استوار ہے؟ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس اُمت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟ وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر خدا کی کتاب قرآن کریم ہے"

(قائداعظم محمد علی جناحؒ - اجلاس مسلم لیگ کراچی ۱۹۴۳ء)

"اس وقت میدانِ سیاست میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی جنگ ہو رہی ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ کون فتح یاب ہوگا۔ علم غیب تو خدا کو ہے۔ لیکن میں ایک مسلمان کی حیثیت سے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم قرآن مجید کو اپنا آخری اور قطعی رہبر بنا کر ثبات اور استقامت پر کاربند رہیں اور اس ارشادِ خداوندی کو کبھی فراموش نہ کریں کہ مسلمان سب بھائی بھائی ہیں۔ تو ہمیں دنیا کی کوئی طاقت یا کئی طاقتوں کا مجموعہ بھی مغلوب نہیں کر سکتا"

(قائداعظم محمد علی جناح۔ حیدر آباد دکن ۱۴ جولائی)

"اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاداری کا مرجع خدا کی ذات ہے۔ جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام و اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے۔ نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارے کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست اور معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں، اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے"

(قائداعظم محمد علی جناحؒ)

یہ اقتباسات، ہمارے تین عظیم المرتبت محسنین، سر سید احمد خانؒ، علامہ اقبالؒ اور قائداعظم محمد علی جناحؒ کے اعلیٰ و حسین مشن کو بڑے ہی اختصار و دلکش الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ ان بزرگوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی، فکری اور سیاسی میدانوں میں جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے زندگی بخش تذکرے سے تاریخ کے اوراق مزین ہیں۔ ان ارشادات میں گو میلوں و برسوں کا مکانی و زمانی فاصلہ حائل ہے۔ تاہم فکری ہم آہنگی کی یہ بڑی ہی نادر مثال ہیں۔ ان میں ایک ہی بات کو، اپنے اپنے زمانے کے حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کی زبوں حالی و ذلت کا بنیادی سبب قرآن سے دوری اور عملی طور پر اس کا ترک کرنا ہے۔ یہ مرض ہے اور اس کا علاج یہ ہے کہ مسلمان پھر سے قرآن حکیم کو اپنی زندگی کا قطعی و آخری رہبر و مرکز بنائیں۔

اس عظیم الشان مقصد کے حصول کی خاطر، ہمارے ان تینوں بزرگوں نے تعلیمی، فکری اور سیاسی میدان میں مسلمانوں کی تربیت و تنظیم میں دن رات ایک کر دیئے جس کا فطری نتیجہ یہ نکلا کہ وہ قوم جو راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئی تھی، قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں "یک جان اور یک قالب" بن کر اٹھی، اور ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء میں، لاہور میں اس نے مطالبۂ پاکستان پیش کیا۔ "قرآنی احکام و اصول کی حکمرانی" کے قیام کی اس کوشش کی، ہندوؤں اور انگریزوں نے بڑی سخت مخالفت کی۔ انہوں نے نیشنلسٹ مسلمانوں کی مدد سے مسلمانوں کے اس تاریخی اور حق پر مبنی مطالبہ و تحریک کو ختم کرنے کے لیے کوئی حربہ اٹھا نہ رکھا۔ مگر قائداعظم محمد علی جناح نے اس حق بات کو مسلمانوں کے دلوں میں کچھ اس سوجھ بوجھ سے اتار دیا تھا کہ یہ حق ان کی زندگی کا تقاضا بن گیا۔ لہٰذا ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان، مسلمانانِ ہند کو ایک مملکت کی صورت میں مل گیا۔ حصولِ پاکستان کا واحد مقصد، سر سید احمد خان، علامہ اقبال اور قائداعظم کی نگاہ میں "قرآنِ حکیم کو مسلمانوں کی زندگی کا قطعی اور آخری رہبر و مرکز بنانا تھا۔ ان بزرگوں نے قرآن حکیم کی اس بنیادی تعلیم کو، جس حرارتِ دینی، علمی قابلیت، عصری بصیرت اور فنی مہارت سے قوم کے سامنے پیش کیا تھا" اس کے پیش نظر اس تعلیم کو پاکستان کی آنے والی نسلوں تک پہنچانا ہمارا فرض بنتا تھا۔ مگر بدقسمتی سے، پاکستان بنا ہی تھا کہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح ہم سے رخصت ہو گئے۔ بعد میں آنے والوں نے، پاکستان ہی کو جو ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا، مقصد سمجھ لیا۔ گویا زاغوں کے تصرف میں عقابوں کا نشیمن آگیا۔ ہندوؤں اور تحریک پاکستان کے مخالف نیشنلسٹ علما نے مل کر ایک سازش کے تحت پاکستان میں ایسی فضا پیدا کر دی کہ وہ جلیل القدر مقصد جو پاکستان کی بنیاد تھا۔ ہماری آنکھوں سے اوجھل کر دیا گیا۔ قوم فکری و عملی انتشار کا شکار ہو کر رہ گئی۔ ناتجربہ کار، خود غرض اور خود ساختہ سیاستدانوں کے ہاتھوں ملک دو نیم اور تمام معاشرہ فساد و

اضطراب کا آئینہ دار بن گیا۔ معاشی ترقی کے جو مواقع قیام پاکستان کی برکت سے ہمیں ملے تھے۔ ان کا رخ "سوئے قبلہ" نہ ہونے کی وجہ سے، زندگی کے ہر شعبے میں، محرومی، بددیانتی، زر پرستی، دھوکہ دہی، بداعتمادی اور نمائش پسندی کی حکمرانی عام ہوتی چلی گئی۔ غرض یہ کہ معاشرے میں ہر سمت "Water Water Every where and not a Drop To Drink" کا نقشہ دکھائی دینے لگا ؎

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں اقبال

پاکستانی معاشرے کو اس فساد و خلفشار کے جہنم سے نکال کر پھر اسے قرآنی مقاصد کی طرف گامزن کرنے کے لیے جن لوگوں نے نہایت ہی اخلاص، دانشمندی، دیانت و تدبر سے قوم کی راہ نمائی کی ہے ان میں محترم پرویز صاحب کا نام بڑا ہی نمایاں نظر آتا ہے۔ ؏

عشق کے درد مند کا طرزِ کلام اور ہے

سرسیدؒ، اقبالؒ و جناحؒ کے مشن کی آبیاری

قیام پاکستان کے بعد ملا پنوں اور بیگانوں کے منفی رویّوں کی وجہ سے، سرسید احمد خانؒ، علامہ اقبالؒ اور قائداعظم محمد علی جناحؒ کے مشن کو جو نقصان پہنچا تھا۔ اس کا ازالہ کرنے کے لیے، پرویز صاحبؒ واحد شخص ہیں جو خم ٹھوک کر آگے بڑھے اور انہوں نے اپنے خونِ جگر کی آمیزش سے نہ صرف اس مشن کو تابندہ کر دیا بلکہ اس میں چار چاند لگا دیئے۔ اس عظیم مشن کے خدوخال، اغراض و مقاصد کو قرآن حکیم کی روشنی میں اس خوبصورتی سے قوم کے سامنے پیش کیا کہ مخالفینِ پاکستان کی تمام کوششیں اور تدبیریں دھری کی دھری رہ گئیں۔ قیام پاکستان کے مقصد اور اہمیت پر جو لٹریچر انہوں نے قوم کو دیا ہے اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ اس لٹریچر نے پاکستان کی بنیادوں کو بڑا استحکام بخشا ہے۔ آنے والی نسلیں اس پر جس قدر بھی فخر کریں کم ہوگا۔

قرآن المحبوب نظر

پرویز صاحب اپنے آپ کو ۱۹۳۰ء کا پاکستانی کہا کرتے تھے۔ کیونکہ اسی سال علامہ اقبالؒ نے مسلمانانِ ہند کے لیے ایک الگ ملک کا مطالبہ الٰہ آباد میں، اپنے خطبہ صدارت میں پیش کیا تھا۔ شروع ہی سے پرویز صاحب کا شمار علامہ اقبالؒ کے معنوی شاگردوں میں ہوتا رہا ہے۔ لہٰذا جب تحریکِ پاکستان کچھ آگے بڑھی

تو علامہ اقبال کی طرف سے قرآنی تعلیمات کو ایک مربوط انداز میں مرتب کرکے پیش کرنے کی ذمہ داری ان کے سپرد ہوئی۔ چنانچہ قرآن حکیم کو مسلمانوں کا محبوبِ نظر بنانے، اور قرآنی احکام اور اصولوں کی حکمرانی کے قیام کے لیے، مناسب فضا پیدا کرنے کی غرض سے، انہوں نے علامہ اقبال کی ہدایات کے مطابق، پیامِ محمدی کو دلکش انداز میں ۱۹۳۸ء میں عام کرنا شروع کیا۔ اور ۱۹۸۴ء میں تادمِ مرگ اپنے اس مشن کی تکمیل میں لگے رہے۔ اس عرصہ میں وہ شب و روز، عصرِ حاضر کے قارونوں، ہامانوں، فرعونوں اور سامریوں کی برپا کی ہوئی تاریکیوں میں چراغِ مصطفوی کی لَو کو زیادہ سے زیادہ بلند کرتے گئے۔ ان کی اس جگر کاوی اور دل سوزی کے نتیجہ میں قرآن حکیم کی تعلیمات و مقاصد پر ایسا لاثانی لٹریچر تخلیق ہو گیا ہے جس میں

"پارس کی سی خصوصیت ہے کہ کوئی ہو کہیں کا ہو اس سے چھوا نہیں اور کندن ہوا نہیں"

۲۵ سالہ غریب الوطنی کے دوران، مجھے درجنوں ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا جو ملے تو پرویز صاحب کو اپنی لاعلمی اور مخالفین کی پھیلائی ہوئی تہمتوں کے اثر میں گالیاں دیتے ہوئے ملے۔ مگر جیسے پرویز صاحب کا کوئی مضمون یا کتاب ان کی نظر سے گذری، تعصب اور بدگمانی کی دھوپ ڈھلتی چلی گئی، اور جب قرآنی حقائق نے دلوں کی تنگی کو وسعت و کشادگی بخشی تو وہ پرویز صاحب کے بھی معترف و شیدا بنتے نظر آئے۔ سچ ہے قرآن جس کا محبوبِ نظر ہو وہ زمانے کا محبوب کیوں نہ بنے ؎

وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے — اک نظر تم میرا محبوبِ نظر تو دیکھو

فیضؔ

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

اب تک قرآن حکیم کی جو تفسیریں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے بیشتر مروّجہ عقائد کے علم برداروں نے لکھی ہیں۔ جن میں اپنے عقائد کی تائید و حمایت کے سوا کچھ نہیں ہوتا یعنی جو عقائد مفسّر نے وراثت میں پائے انہی کی بنیاد پر قرآن کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور چونکہ تمام عالمِ اسلام فرقہ بندی کے شرک میں مبتلا ہے، اس لئے یہ تفاسیر خوب بکتی ہیں۔ جس کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت کی دلیل سمجھ لیا جاتا ہے ؎

یا رب میرے گناہ کی عظمت پر غور کر
اپنی خطا کو تیری رضا کہہ گیا ہوں میں

اندھی تقلید اور نیم حکیمی کے اس ماحول میں نہایت بلند آواز سے یہ کہنا کہ ؎

"قرآن کی طرف پہلے سے اپنے نظریات لے کر آنا اور قرآن سے اس کی تائید حاصل کرنا شرک ہے۔" پرویزؒ

یہ پرویز صاحبؒ کا حصّہ ہے۔ انہوں نے بڑی شد و مد سے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ کلام الٰہی کی تعبیر میں

اپنے نقطۂ نظر اور پسند و ناپسند کا جواز نہ تلاش کیا جائے۔ بلکہ سنت نبویؐ کی سچی پیروی سے، قرآن کو قرآن ہی سے سمجھ کر پیش کرنا چاہیئے ؎

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

قرآن کو قرآن ہی کے آئینہ میں پیش کرنے کا فرض انہوں نے بڑی قابلیت، علمی دیانت، جرأت اور استقلال سے انجام دیا ہے۔ یہ روش انہیں تمام مفسرین قرآن کے مقابلے میں بڑا منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ ہزارہا صفحات پر پھیلے ہوئے، قرآنی تعلیمات پر، ان کے مضامین پڑھتے چلے جائیے ہر جگہ ذات باری تعالیٰ کے ارشادات قرآن کریم کے الفاظ میں نظر آئیں گے ہر کہیں قرآن کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ ہی بولتا نظر آتا ہے۔ کوئی امام یا بزرگ پسِ پردہ دکھائی نہیں دے گا۔

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول اقبالؔ

حق گوئی و بیباکی

پرویزؒ صاحب کی تمام زندگی قرآن پاک کو حق ماننے اور منوانے میں گذری ہے۔ نظریۂ پاکستان کی بنیاد "ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب لہٰذا ایک قوم" کی حقیقتِ قرآنی پر تھی۔ اس لیے پرویز صاحبؒ نے بحیثیت ایک مجاہد کے تحریک پاکستان میں شرکت کی۔ دو قومی نظریہ کو قرآن کی روشنی میں علامہ اقبالؒ کے بعد، جس حق گوئی اور بے باکی سے پرویز صاحب نے پیش کیا ہے۔ تاریخ اس کی گواہ ہے۔ تحریک پاکستان کے مخالف علما سے جس طرح پرویز صاحب نے چومکھی جنگ لڑ کر اُسے کامیاب بنایا ایک زمانہ اس سے واقف ہے۔ لیکن جس جرأت، بلند ہمتی، علمی دیانت، تدبر اور ایمانی قوت سے انہوں نے "حدیث و سنت" سے متعلق مروجہ جذباتی غلط عقائد، تصورات و خیالات کے خلاف قرآن حکیم کی روشنی میں مسلسل جہاد کیا اور حدیث و سنت کا صحیح مقام قرآن سے متعین کیا اس کا رنامے پر اگلی صدی کا کوئی مورخ ہی انہیں پوری داد دے سکے گا۔

اس نازک مسئلہ پر سرسید احمد خان کے بعد جس شخص نے بے خوفی سے بے لاگ و لپٹ دو ٹوک انداز میں بات کی ہے۔ وہ پرویز صاحب کی ذاتِ گرامی ہے۔ انہوں نے اپنی مساعی جمیلہ سے، سنت نبویؐ کی عظمت و پاکیزگی کو نہایت ہی دانشمندی سے نہ صرف نیم حکیموں کی دست برد سے بچایا بلکہ قرآن کی کسوٹی پر رکھ کر اسے نئی آب و تاب بخشدی۔ ان کی حق گوئی اور بیباکی کی یہ بڑی نادر مثال ہے۔ اس میں انہوں نے علماء کی شدید مخالفت

کی پرواہ نہ کی۔ مذہب کے خود ساختہ ٹھیکیداروں کی طرف سے انہیں "منکرِ شانِ رسالت، منکرِ حدیث، جیسے نازیبا اور جھوٹے القابات سے نوازا گیا" ۹۹ علما نے جن کا آپس میں نفاق ضرب المثل تھا، ان کے خلاف کفر کا تاریخی فتوٰی لگایا مگر اللہ تعالیٰ کے آخری رسول حضرت محمدؐ کا یہ سچا عاشق حق بات کہنے سے باز نہ آیا ؎

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی   اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اس معاملے میں، سرسید احمد خانؒ، علامہ اقبالؒ، مولانا اسلم جیراجپوریؒ اور کئی دیگر اکابرین اسلام اور پرویزؒ صاحب کا موقف ایک جیسا ہے۔ ہر وہ حدیث جو قرآن کی تعلیم کے خلاف یا جس سے حضور نبی اکرمؐ کی ذات پاک اور صحابہ کرام کی پاکیزہ زندگیوں پر، کسی بھی قسم کا طعن پڑتا ہو اس کی بابت پرویزؒ صاحب صرف اس قدر کہتے ہیں کہ "حضورؐ کی طرف سے اس کی نسبت درست نہیں معلوم ہوتی"۔

معراج انسانیت

حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی سے پرویزؒ صاحب کو جو عقیدت بلکہ عشق ہے، ان کی زندہ شہادت ان کی مایۂ ناز تصنیف "معراج انسانیت" ہے۔ یہ کتاب اسلامی ادب میں بڑا ہی مبارک، مستحسن اور منفرد اضافہ ہے۔ رسولؐ اللہ کی سیرت پاک کی بزرگی، عظمت، اکملیت، آفاقیت، اور حسنِ جمال و جلال کو جس آن بان اور شان سے پیش کیا ہے۔ اس کی صحیح داد کے لیے علامہ اقبال جیسے عاشق رسول کی ضرورت پڑے گی معراج انسانیت میں حضرت محمدؐ کے اُسوہ حسنہ کے رخ روشن کو، قرآن حکیم کی روشنی میں اس قدر دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ ہر دو کی صداقت، عظمت، شفا و رحمت اور نورانیت کے سامنے نگاہ بصیرت پروانہ وار نثار ہو ہو جاتی ہے کیونکہ   ایں را نہایتے است نہ آں را نہایتے

حضورؐ کی سیرت پاک پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر ان میں سے بیشتر انسانوں کی مرتب کردہ تاریخ کو بنیاد بنا کر لکھی گئی ہیں۔ جس کی وجہ سے قاری کے دل میں ایک تشنگی کا احساس باقی رہ جاتا ہے۔ اور ایک ہوک سی اٹھتی ہے ؎

مشاطہ را بگو کہ براسباب حسنِ یار   چیزے فزوں کند کہ نظارہ بما رسی

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر، معراج انسانیت پہلی کتاب ہے۔ جس میں تاریخ کو قرآن کریم کے تابع رکھا گیا ہے۔ اور قرآن حکیم کے آئینہ میں صاحب قرآن کی حسین و جمیل و جلیل شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اس بھرپور انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کہ دل و دماغ جھوم جھوم اٹھتے ہیں۔ مصنف نے حضورؐ کے کردار کی بلندی اور حسنِ بیان و عمل کو، اللہ تعالیٰ کی دائمی شہادتوں کی تائید کے ساتھ ایسے جذب و ہوش فرزانگی

سادگی سے بیان کیا ہے کہ نظارہ زجنبیدن مژگاں گلہ دارد

حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہ

ان تین تاریخی الفاظ میں، شاہکار رسالت حضرت عمر فاروقؓ نے قرآن کریم کی ابدیت، آفاقیت، اکملیت جامعیت اور اہمیت کو جس اختصار سے ادا کیا ہے۔ اس کا احساس ہمیں علامہ اقبالؒ نے خطبات میں بڑے ہی پُر زور الفاظ میں دلایا ہے۔ ہمارے دور میں، سرسید احمد خانؒ، علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے بعد، چوتھے نمبر پر ہمیں پرویز صاحبؒ ملتے ہیں۔ جنہوں نے "حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہ" کے فاروقی نعرے کو نہایت ہی بے جگری، قوت اور دانشِ فرقانی، سے بلند کیا۔ سنت نبویؐ کی سچی پیروی یہی ہے کہ حضورؐ کی تعلیم و پیام جس کو خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کی دفتین میں محفوظ کرا دیا۔ اس کا پورا پورا نفاذ انسان کی ارضی زندگی میں بھی عام ہو جائے۔ اور اللہ و رسولؐ کی کبریائی، رحیمیت، ربوبیت اور نورانیت کا جیتا جاگتا منظاہرہ، خارجی کائنات کے دیگر گوشوں کی طرح، دنیا آنکھوں سے دیکھ لے۔

عہد آفریں لٹریچر

اس عظیم الشان مقصد کے حصول کے لیے، پرویز صاحبؒ، نے علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی راہ نمائی میں حصول پاکستان کی جنگ میں بھرپور حصہ لیا۔ اور بے شمار دشواریوں کے باوجود، اپنے مقصد کے اہم سنگِ میل، یعنی پاکستان کو حاصل کیا۔ اس طرح گویا مسجد کی تعمیر کے لیے زمین مل گئی اب اس سرزمین پاکستان پر قرآنی نظامِ ربوبیت کے نفاذ کے لیے قوم کو تیار کرنے کا دشوار ترین مرحلہ باقی تھا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ درخشاں میں دنیا نے اس نظام کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ تو دیوانہ وار اس پر ٹوٹ پڑی تھی۔ مگر بعد میں خود ہمیں نے اس کے بخیئے ادھیڑ دیئے تو دنیا پھر سے اپنی بے ڈھنگی چال پر آگئی و بھٹکے ہوئے آہوئں کو پھر سوئے حرم لے جانے کے لیے، پرویزؒ صاحب نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ، قرآنی لٹریچر کی تخلیق میں صرف کر دیا۔ اور قوم کو ایسا عہد آفریں لٹریچر عطا کر دیا۔ جس کی فتوحات دن بدن بڑھتی جائیں گی۔" قرآن نما" اس لٹریچر میں سطحی وجذباتی اپیل کہیں نظر نہیں آتی۔ ہر جگہ آبا پرستی کی جگہ عقل وشعور سے خطاب ہے۔ بہترین دلائل اور زمانہ حاضر کی علمی سطح کو سامنے رکھ کر بات سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر ٹھنڈی آگ کی طرح نہایت ہی خاموشی سے اپنا کام کر جاتی ہے۔ ہمارا عہد چونکہ سطحی جذبات کی شورانگیزی کا شکار ہے اس لیے ان کے تخلیق کردہ قرآنی لٹریچر کی ہمہ گیر فتوحات میں قدرے تاخیر ہو رہی ہے، پرویزؒ صاحب

کی عہد آفرین تصانیف اور کام مسلمانوں کے درمیان سے وہ گرد و غبار و کہر و دھواں جو مخالفین نے اپنے جلے پھپھولے پھوڑ کر پیدا کیا ہے۔ اب آہستہ آہستہ دور ہو رہا ہے۔ اور ان کی تصانیف کی مقبولیت، دل کشائی اور دل گیری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لغات القرآن، تبویب القرآن، مفہوم القرآن، من و یزدان، کتاب التقدیر، شاہکار رسالت وغیرہ ایسی عہد آفرین تصانیف ہیں۔ جو قرآن کے ہر طالب علم کے لیے مشعل راہ ثابت ہوں گی اور عام اُردو دان حضرات کو اس محتاجی و مہجوری سے نجات دلا دیں گی۔ جو قرآن فہمی کے سلسلے میں وہ محسوس کرتے ہیں۔ ان تصانیف میں قرآنی مقاصد، قرآنی اصطلاحات ان کی وسعت و گہرائی کو قرآن ہی کی روشنی میں اس بصیرت زیبائی، برنائی سے پیش کیا گیا ہے۔ کہ حضور نبی اکرمؐ کے پیغام کے تمام خدوخال اپنی رعنائی و کمال کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں، اور دلوں کی دھڑکن اللہ کی رب العالمینی اور حضرت محمدؐ کی رحمت للعالمینی کے انسانی معاشرہ میں پھر جلوہ افروز ہونے کے تصور سے تیز ہو جاتی ہے۔ ؎

دلوں میں پھر ولولۂ انقلاب ہے پیدا
قریب آگئی شاید جہانِ پیر کی موت — اقبال

جوانوں کی پریشاں نظری کا علاج

وہ ہماری آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت، قرآنِ حکیم کی تعلیمات کی روشنی میں کرنا چاہتے تھے۔ سرسید احمد خان کی طرح، وہ ایک ایسا تعلیمی ادارہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ جو دنیا کے تمام مسائل کا حل قرآن کی روشنی سے ثابت کر کے، قرآن کی عظمت کا لوہا منوا لے۔ جہاں سے کم از کم ایک پوَد ایسی تیار ہو کر نکل جائے، جو پاکستان میں "قرآن کی حکمرانی" کے امکانات کو روشن تر کر دے۔ صد افسوس کہ پرویزؒ صاحب کی یہ حسین تمنا لب پہ دعا بن کر آئی، مگر قوم کی غفلت و دوں ہمتی کے باعث، برنہ آئی اور وہ ہم سے رخصت ہو گئے۔ لیکن یہ مردِ قلندر ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کا قائل نہ تھا۔ اور نہ ہی قوم کی غفلت و دوں ہمتی کے شکوہ میں وقت برباد کرنے کا عادی، سلیم کے نام خطوط، طاہرہ کے نام خطوط، اسلامی معاشرت، فردوسِ گم گشتہ، قرآنی فیصلے، چھ خطبات، سلسبیل وغیرہ ایسی نادر کتابوں کا تحفہ وہ قوم کو دے گئے ہیں۔ جس پہ آنے والی نسلیں فخر کریں گی۔ قرآن کی صراط المستقیم کی قائل اور اس کی طرف مائل کرنے والی ان تصانیف میں طلبا و طالبات کو ان کی تمام پریشاں نظری کا علاج بتا دیا گیا ہے۔ یہ کتابیں بڑی ہی شگفتہ اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہیں۔ انکی دلکشی اور اثر آفرینی کا یہ عالم ہے کہ ایک بار کوئی انہیں اٹھالے تو ختم کیے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ ان میں انسانی زندگی کے ہر درد کی قرآنی دوا کی طرف راہ نمائی کی گئی ہے۔ اور ہر الجھن کو قرآن اور سیرت پاکؐ کی دائمی روشنی میں حل

کرنے کی بڑی ہی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ علامہ اقبالؒ کی تصانیف کی طرح ان کتابوں کو بھی بڑی عمر نصیب ہو گی اور ان کی اہمیت و اثر آفرینی، ہمارے علمی معیار کی ترقی کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جائے گی۔ ان "قابل صد رشک" کتابوں میں پرویزؒ صاحب نے ایک ایسا قالب تیار کر دیا ہے۔ کہ جب ہماری آنے والی نسلیں اس میں ڈھل کر نکلیں گی۔ تو اللہ کے وعدے کے مطابق قوت و عظمت، شان و شوکت، اتحاد و تنظیم، اقتدار و کامرانی، سرفرازی و کشادگی اور جہانگیری ہماری تقدیر بن جائے گی۔ اور ان کی بدولت ایک "سراجِ منیرؐ" کا شیفتہ و گرویدہ ہو کر قرآنی رحمت و ربوبیت کی فردوسِ بریں کی تعمیر میں مصروف نظر آئے گا۔

تاریخ کا غلط احترام

علامہ اقبالؒ نے قرآن، کائنات اور تاریخ کو انسانی علم کا منبع قرار دیا ہے۔ اور تاریخ کی بابت کہا ہے۔ کہ یہ انسانی حافظہ کی مانند، قوم کو خود آگاہی کی نعمت عطا کرتی ہے۔ بلاشبہ قوم کو بنانے اور بگاڑنے میں تاریخ کو بڑا دخل حاصل ہے۔ اگر یہ صحیح طور پر، بغیر کسی تعصب و غلو کے، مرتب ہو جائے تو قوم کو خوب سے خوب تر بنا دیتی ہے۔ اور اگر بدقسمتی سے اس کی تدوین و ترتیب میں، سچی شہادت، صداقت، دیانت اور Objectivity کے آفاقی اصول کی جگہ محض اندھی عقیدت و نفرت، غلو اور آباء پرستی کے سطحی جذبات سے کام لیا جائے۔ تو پھر یہ مسخ شدہ تاریخ قوم کو پستی و زوال کے بھنور سے نکلنے نہیں دیتی۔ اور اس کی خوش حالی اور ترقی کی راہ میں خود حائل ہو جاتی ہے۔ ہمارے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ ہم نے بہت سی کتابوں کو عملی طور پر قرآنِ پاک کی جگہ دے رکھی ہے۔ ان کو اس قدر مقدس بنا دیا ہے۔ کہ ان میں مندرجہ واقعات و معلومات خواہ کتنے ہی خلاف عقل و دانش کیوں نہ ہوں ہم انہیں آنکھیں بند کیے قبول کرتے چلے آ رہے ہیں۔ سراب عقیدت نے "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست" کو آیتِ الٰہی کا درجہ دے دیا ہے۔ اپنوں اور بیگانوں نے اپنی اپنی مفاد پرستی کے لیے کچھ اس حسین انداز سے ہماری تاریخ کو مسخ کر دیا ہے ؎

جنوں کا نام خرد پڑ گیا، خرد کا جنوں — جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ آج ہماری تاریخ، اتحاد، تنظیم، قوت و شوکت و عظمت کی محرک بننے کی بجائے ہمارے انتشار و پستی، ذلت و زبوں حالی، فرقہ بندی و نفاق کا باعث بنی ہوئی ہے۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ اس مسخ شدہ تاریخ کا غلط احترام دلوں میں پیدا کر دیا گیا ہے۔ نتیجتاً ہماری باز آفرینی کی راہ میں خود ہماری تاریخ حائل ہو گئی اور اسلام سربلندی، کامرانی و خوشحالی کا ضامن بننے کی بجائے "بارِ دوش" بن کر رہ گیا ہے بقول اکبر و اقبالؒ

یہ صندوقِ کتب بھاری ہے یارب اٹھ نہیں سکتا — یہ مذہب ہے تو مجھ سے بارِ مذہب اٹھ نہیں سکتا (اکبر)

تمدن، تصوف، شریعت کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام
یہ امت "روایات" میں کھو گئی — حقیقت خرافات میں کھو گئی
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

عالم اسلام۔ راکھ کا ڈھیر!

یہ حقیقت کا خرافات میں کھو جانا ہی تو ہے۔ کہ جس کے باعث ملّتِ اسلامیہ کی کوئی موج صدیوں سے ساحلِ مراد سے نہ ٹکرا پائی ہے۔ ذرا اپنی تاریخ کے غلط احترام کی کرشمہ سازی دیکھئے۔ آج عالم اسلام پر نظر ڈالیں اور اپنی "مرگِ بے شرف" کی تصویر دیکھیں۔ برسوں سے، اسرائیل، امریکہ و روس، مشرقی وسطیٰ اور افغانستان میں، ہماری ملی غیرت و حمیت کو تار تار کر رہے ہیں۔ مگر ہم اپنی بقا اور باز آفرینی کے لیے انہیں کو خدا بنائے ہوئے ہیں۔ ان کی مرضی کے بغیر ہمارے ملکوں میں کوئی پتہ تک نہیں ہل سکتا۔ قرآنِ حکیم نے ہم سب کو بھائی بھائی بنایا تھا۔ مگر یہ کیسے بھائی ہیں، کہ برسوں سے عراقی ایرانیوں کا گلا کاٹ رہے ہیں۔ اور ایرانی انہیں مکمل طور پر تباہ کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ مصر و لیبیا ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ محض معاشی نظریات میں اختلاف کی بنا پر افغانی اپنے ہی افغانی بھائی کے خون کا پیاسا بنا ہوا ہے۔ اس تباہ کن روش سے، مسلمانوں کو نہ قرآن روک پاتا ہے۔ نہ فرمانِ رسولؐ، دُور کیوں جایئے جو کچھ لاہور اور کراچی میں حال ہی میں ہوا ہے۔ جس میں بھائی نے بھائی کا خون جس بے دردی سے بہایا ہے۔ ؏

یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خون ریز ہے ساقی؟

دوسری طرف ذرا دیکھئے۔ ہم نماز پڑھتے ہیں۔ جس کا نتیجہ قرآن نے ہر قسم کی خود غرضی اور فحاشی و منکر سے لازمی نجات بتایا ہے۔ مگر ہماری زندگیاں خود غرضی کا شاہکار و اشتہار بنی ہوئی ہیں۔ کل تک ہم زکوٰۃ انفرادی طور پر "خیرات" کی صورت میں دیتے تھے اور اب خیر سے اجتماعی طور پر بانٹی جاتی ہے۔ مگر جسم و جاں کی پوری پوری نشوونما تو دُور کی بات ہے۔ ہماری موجودہ زکوٰۃ تو اس "جسم و جاں" کے رشتہ کو محض برقرار رکھنے میں بھی ناکام دکھائی دیتی ہے۔ ہم روزے رکھتے ہیں اور رمضان کی آمد اور اس کے احترام کا اس قدر شور مچاتے ہیں، کہ قرآن کی تعلیمات ہماری آنکھوں کے سامنے اس شور میں دب جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی کبریائی (جو قرآن نے صیام کا مقصد بتایا ہے) کی جگہ نمرود کی خدائی قدم قدم پر معاشرہ میں نظر آتی ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے۔ کہ "زبانِ حق نوانہ" پر اس کا اعتراف بھی ہے۔ ہر سال لاکھوں کی تعداد میں ہم فریضہ

حج ادا کرتے ہیں۔ اور اس ہنگامہ طواف وحج کو بڑی دھوم دھام سے اخبارات اور ٹی وی کے ذریعہ دنیا کو دکھاتے پھرتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے۔ تمام عالمِ اسلام دنیا کے لیے رحمت وعظمت کی مثال کی بجائے تصویر عبرت بنا ہوا ہے۔ ؎

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے۔
نماز، روزہ و قربانی و حج یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے۔ اقبال

تمام دنیا ہمارے دعوے اسلام یعنی "اسلام کے پاس نوعِ انسانی کے ہر درد کی دوا ہے" کو سن کر طنزاً یہی کہتی ہے ؎ بہ آدمے نہ رسیدی خدا راچہ می جوئی

قرآن کی کسوٹی

پرویزؒ صاحب نے اپنی قابلِ فخر کتاب شاہکارِ رسالتؐ میں، جس مثبت انداز میں، ہمارے تاریخ کے اس غلط احترام کا احساس دلایا ہے۔ اپنی جگہ یہ بڑا ہی قابلِ قدر تاریخی کارنامہ ہے۔ قرآن حکیم کی اکبری و سرمدی ثابت کرنے کے لیے اس کے آفاقی، دائمی اصولوں کی روشنی میں تاریخ کا صحیح مقام متعین کرنے کی یہ بڑی ہی واضح اور جرأت مندانہ کوشش ہے۔ انہوں نے بڑے قاطع دلائل اور دلکش واضح انداز میں ثابت کیا ہے کہ ہماری "ناحکمیٔ دل، ذہنی انتشار اور گمراہی کا اصل سبب بقول اقبال یہی تاریخ کا غلط احترام ہے۔ جس نے تمام عالمِ اسلام اور قرآن کو مہجور بنا کر رکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن پاک کی صورت میں بہترین ضابطہ حیات اور محمدؐ جیسا کامل، محسن، اور بہترین خوبیوں کا حامل نبی عطا کیا۔ مگر ہم نے دونوں سے بے وفائی کی۔ عام انسانوں کی کتابوں کو عملاً قرآن حکیم کی جگہ اور ان کے مصنفین کو محمدؐ رسول اللہ کی جگہ بٹھا دیا۔ تو پھر پوچھتے پھرتے ہیں۔ کہ ہماری شبِ تار کی سحر کیوں نہیں ہوتی؟

پرویزؒ صاحب نے قرآن حکیم کی کسوٹی پر، ہماری تاریخ اور دیگر بزرگوں کی تصانیف کو پرکھنے کی جو طرح ڈالی ہے۔ اس سے ہماری بازآفرینی کے امکانات روشن ہو گئے ہیں۔ فاصلہ خواہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو اگر صحیح سمت میں پہلا قدم اٹھ جائے تو منزلِ مقصود ایک دن ضرور قدم چوم لیتی ہے۔ جوں جوں رسول پاکؐ اور صحابہ کرامؓ کے درخشندہ کارنامے قرآنی شہادت کی روشنی میں نکھر کر مسلمانوں کے سامنے آتے چلے جائیں گے۔ توں توں ہماری اجتماعی وانفرادی زندگی قرآنی قالب اختیار کرتی چلی جائے گی۔ کیونکہ جیسا قالب ویسی قوم۔

نرالا بت شکن

بظاہر مسلمانوں کی تاریخ میں بہت سے صاحب نظر بت شکن نظر آتے ہیں۔

مگران میں سے اکثر ایسے بت شکن ثابت ہوئے ہیں۔ کہ جہاں انہوں نے ایک بت کو انسانیت کی راہ سے ہٹایا تو ساتھ ہی دوسرا بت اس کی جگہ سجا دیا۔ یا پھر خود ہی شکستہ بت کو ہٹا کر اس کی جگہ پر "براجمان" ہو گئے ؎

خود طلسم قیصر و کسریٰ شکست　　خود سر تختِ ملوکیت نشست

یہ کارنامہ ہم نے اس وقت انجام دیا تھا۔ جب آتش جوان تھا۔ پھر ہم پر ادبار اور پستی کا ایک ایسا دور بھی آیا۔ کہ ہم نے قرآن، خدا، محمدؐ و کعبہ ہی کو بت بنا کر رکھ دیا۔ ؎

خدا کے واسطے کعبے سے پردہ نہ اٹھا ظالم　　کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

ہماری تاریخ میں پرویزؒ صاحب نہایت ہی بانکے اور نرالے بت شکن ثابت ہوئے ہیں۔ انہوں نے اقبالؒ کی پیروی میں نہ صرف بتانِ عصرِ حاضر کی نشان دہی کی۔ بلکہ ان طرح طرح کے بھیسوں میں آنے والے لات و منات پر چراغ مصطفویؐ کی روشنی میں، علومِ قرآن کی ایسی ایسی ضربیں لگائی ہیں کہ انکے پجاریوں نے "ہری ہری" کی چیخوں سے آسمان سر پر اٹھا لیا ہے ؎

ہم کعبہ و ہم بت کدہ سنگِ راہِ ما بود
رفتیم و صنم بر سرے دیوار شکستیم

خواہ وہ بتانِ عجم یعنی تمدن، تصوف، شریعت، کلام ہوں، یا عصرِ حاضر کے قارون، ہامان، سامری، و فرعون ہوں۔ وہ کون بت ہے۔ جس کو اس غلام احمدؐ نے، تیشۂ قرآن سے پاش پاش نہیں کیا۔ اپنی جگہ یہ بت شکنی ہی ایک بڑا کارنامہ ہے۔ مگر ان کا اس سے بھی بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ان تمام بتوں کو حریمِ دل سے نکال کر، ان کی خالی جگہ پر، اپنی "علمیت و بزرگی"، کا بت نہیں سجایا۔ بلکہ دلوں کو قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے معمور کر دیا۔ ان کے کردار کی یہ بلندی سنتِ نبویؐ کے حقیقی اتباع کا صدقہ نظر آتی ہے ؎

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا　　ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

ہے مومن کی اذاں اور

پرویز صاحب طبعی قانون کے مطابق ہم سے جدا ہو گئے، ان کی طبعی زندگی ان کے عظیم و عالم گیر مقاصد سے کم تھی۔ انہوں نے برسوں کی جگر کاوی سے تحریک طلوع اسلام کو ایسی عہد آفرین تصانیف، اور درسِ قرآن کے سیکڑوں ٹیپ عطا کئے ہیں۔ جن کی جہانگیر فتوحات اور عالمگیر اثرات کا نہ صرف دوستوں بلکہ ان کے مخالفین کو بھی یقین ہے ؎

اگرچہ تو درمیاں نہیں ہے مگر تیری روشنی ہے اب بھی ضیائیں پھیلی ہیں انجمن میں چراغ پردے میں جل رہا ہے

خون دل وجگر کے سرمائے سے تخلیق کردہ قرآنی لٹریچر کی صورت میں انہوں نے وہ اذان دے دی ہے۔ جس کی بابت علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

اس اذان نے قرآنی معاشرے کے قیام کو یقینی بنا دیا ہے۔ اس اذان کی آواز کو، گھر گھر تک پہنچانے کا انتظام کرنا اور تمام دنیا میں عام کرنا اب تحریک طلوع اسلام کے متعلقین کا فرض بنتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے، کہ اس منظم اسکیم کے تحت، سرسید احمد خاں کی طرح، ان تعلیمات کو آگے بڑھایا جائے۔ بغیر اس کے دور رس نتائج پیدا نہیں ہو سکتے۔ تحریک طلوع اسلام سے وابستہ احباب کو چاہیئے کہ ہونہار نوجوانوں کو اپنے سایہ تربیت میں لے کر اس کام کو آگے بڑھانے کے قابل بنائے۔

پرویزؒ صاحب نے اللہ اور اس کے رسول کریمؐ کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داریوں کو بڑے ہی حسن کارانہ اور قابل صد فخر انداز میں پورا کر دیا ہے۔ اپنی شعوری زندگی کا ایک ایک لمحہ انہوں نے قرآن اور صاحب قرآن کی عظمت وصداقت، رحمت وشفاعت، شفاء ربوبیت اور حسن وجمال کی گواہی دینے میں گزارا ہے۔ ایسی شہادت کی مثالیں حضور نبی اکرمؐ کے نام لیواؤں میں بہت ہی کم ملتی ہیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اس حسنِ شہادت پر جزائے خیر سے نہیں نوازے گا کیونکہ ؎ صلۂ شہید کیا ہے؟ تب وتابِ جاودانہ

یارب ہماری قوم میں ایسے شہداء عام کر دے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اے۔ کے۔ سرورؔی
سیکرٹری یوگنڈا نیشنل ایجوکیشن بورڈ
یوگنڈا

طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۸۷ء کا مقالہ

عورت بحیثیت انسان

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ ترے دل میں اُتر جائے میری بات

اسلام علیکم۔

قرآن کی روشنی میں "عورت بحیثیت انسان" کے تحت مجھے آج اپنے خیالات کے اظہار کرنے کا موقع ملا ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ میں اپنے استادِ محترم اور انسانیت کے عظیم محسن غلام احمد پرویزؒ مرحوم کی محنتوں اور کاوشوں کی بدولت آج اس قابل ہوں کہ اپنے احباب کو بتاؤں کہ قرآن کے آئینہ میں عورت کا کیا مقام ہے؟ چونکہ ہمارے ملک میں مذہب کے نام پر جو کچھ پیش کیا جاتا ہے اس کا بیشتر حصہ یہودیت اور عیسائیت میں رائج افسانوں پر مشتمل ہے، ان کے حوالے بعض جگہوں پر احباب کو ناگوار گذریں گے۔ جس کی میں معذرت چاہتی ہوں۔ لیکن ان حوالوں سے بات واضح ہو جائے گی کہ ہمارے سامنے اسلام کے نام سے کیا پیش کیا جاتا ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے بعد قرآنی حقائق کو میں سامنے لاؤں گی اس کی حقیقت دین کی رُو سے واضح ہو جائے گی۔ ایک اور بات میں اپنے ساتھیوں کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ میرے پیش نظر نہ کسی سے بحث و مباحثہ ہے اور نہ کسی پر تنقید مقصود۔ میرا مقصد تو قرآنی حقائق کو پیش کرنا ہے۔ اس سے اگر کسی مروجہ عقیدہ یا کسی کے دعویٰ پر زد پڑتی ہے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی، کیونکہ اس باب میں مدعی قرآن ہے، میں نہیں۔

برادرانِ عزیز! عیسائیوں کی مقدس کتاب بائبل میں پیدائش آدم کے بارے میں یوں لکھا ہے کہ "آدم اور اس کی بیوی دونوں جنت میں تھے شیطان نے اس کی بیوی کو بہکایا اور آدم اپنی بیوی کی وجہ سے بھٹک گیا۔ اس بنا پر عیسائیت گناہِ اول کی مجرم عورت کو قرار دیتی ہے۔"

ایک اور سینٹ کا قول ہے کہ

"آدمی عورت سے نہیں پیدا کیا گیا۔ عورت آدمی سے پیدا کی گئی ہے۔ آدمی عورت کے لئے نہیں پیدا کیا گیا۔ عورت آدمی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔"

ایک اور جگہ ہے کہ "عورت شیطان کا دروازہ ہے۔ برائیوں کی راہ اور بچھو کا ڈنک ہے۔" ان کا عقیدہ ہے کہ عورتیں جنت میں نہیں جائیں گی۔ غرضیکہ عیسائیوں کا مقدس لٹریچر عورت کے خلاف بھرا پڑا ہے۔

برادرانِ گرامی قدر! اب ذرا ہماری کُتبِ روایات کو دیکھئے کہ وہ کیا کہتی ہیں؟ تفسیر ابن کثیر کا شمار ہمارے ہاں کی مشہور ترین تفاسیر میں ہوتا ہے۔ اس کتاب میں پیدائش آدم کے بارے میں کہا گیا کہ "حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ ابلیس کی ڈانٹ کے بعد حضرت آدم پر اونگھ ڈال دی گئی اور بائیں پسلی سے حضرت حوا کو پیدا کیا۔" ایک اور روایت میں ہے کہ "ابن مسعود نے فرمایا ابلیس کو جنت سے نکالنے کے بعد جب حضرت آدم کو جنت میں جگہ دی گئی تو حضرت آدم تن تنہا تھے اس وجہ سے نیند میں ان کی بائیں پسلی سے حضرت حوا کو پیدا کیا۔" دوسری جگہ صحیح حدیث میں ہے کہ "عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور یہ پسلی سب سے زیادہ ٹیڑھی ہے پس اگر تو اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرے گا تو یہ ٹوٹ جائے گی۔"

میرے عزیز ساتھیو! اس کے بعد دیکھئے اس ٹیڑھی پسلی کو سیدھا کرنے کے لئے کس قسم کی روایات ہمارے ہاں حضورؐ کی حدیث قرار پا گئیں۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ

"حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ "عورتوں کو مردوں کی اطاعت کرنی پڑے گی"۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ عورتوں کو مارو نہیں۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے عرض کی یا رسول اللہؐ عورتیں آپ کے حکم سے دلیر ہو گئیں ہیں اس پر حضورؐ نے مردوں کو مارنے کی اجازت دے دی۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "اگر میں کسی کو حکم کر سکتا کہ ماسوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کو سجدہ کرو تو عورت کو حکم کرتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔"

برادرانِ عزیز! یہ تو ہمارے مذہب کی رُو سے عورت کی حیثیت ہے، مرد کے مقابلہ میں۔ جہاں تک عورتوں کے گناہوں اور برائیوں کا تعلق ہے، اس سے ہماری کتب بھری پڑی ہیں۔

احادیث کی صحیح ترین کتاب بخاری شریف میں ہے کہ

"حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت کبھی نہ سڑتا اور حضرت

حوّا نہ ہوتی تو کوئی عورت اپنے خاوند سے خیانت نہ کرتی"۔

دوسری روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "میرے پیچھے مردوں پر عورتوں سے بڑھ کر کوئی فتنہ
ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "میں نے جنت میں دیکھا وہاں اکثریت فقیروں کی نظر آئی
دوزخ میں دیکھا تو اکثریت عورتوں کی نظر آئی"۔ یہ صاف نظر آتا ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں نے تو خاص
سازش کے تحت ایسی روایات وضع کیں لیکن وہ ہماری کتبِ احادیث کا حصہ بن گئیں

میرے ساتھیو! انہوں نے تو ایسا کیا ہی تھا لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہم ان روایات کو احادیث
نبویؐ قرار دے کر سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ ان روایات میں خدا اور اس کے
رسول کا تصوّر ہمارے سامنے کیا آتا ہے، کیا یہ سوچنے کی بات نہیں؟

میرے عزیزو! قرآن نے بیک کلمہ باطل کے ان تمام عقائد پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا چنانچہ سورہ
بنی اسرائیل میں ارشادِ ربانی ہوتا ہے۔

"ہم نے تمام انسانوں کو یکساں واجب التکریم پیدا کیا ہے"۔ ۱۷/۷۰

اس لئے پیدائشی اعتبار سے کسی انسانی بچہ میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ خدا نے جس تعظیم و
تکریم کا حامل انسان کو ٹھہرایا ہے اس میں تمام انسان شامل ہیں۔ اور ظاہر ہے انسان میں مرد اور عورت
دونوں شامل ہیں اس لئے قرآن نے جو کچھ انسان کے متعلق کہا ہے اس کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے۔ عورت کو
کسی اعتبار سے بھی مرد سے پست خیال کرنا پیدائشی تفریق کے اسی باطل عقیدہ کی طرف لوٹ جانے کے مترادف
ہے۔ جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا ہے۔

احباب گرامی قدر: قرآن کی رُو سے افضلیت جوہرِ ذاتی کی رُو سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ پیدائش کی رُو
سے اور اس اصول میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ قرآن مبین نے انسان ہونے کی حیثیت سے کس طرح
مردوں اور عورتوں کو یکساں مقام پر رکھا ہے اس کا اندازہ قرآن مبین سے لگائیے۔

سورہ احزاب میں ارشادِ ربانی ہے۔

"اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ قانونِ خداوندی کی اطاعت سے اپنی ذات کی تکمیل کر سکتے ہیں
ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے۔ اگر مرد اس جماعت کے رکن بن سکتے ہیں جو قانونِ
خداوندی کے اٹل نتائج پر یقین رکھتے ہوئے امن عالم کے ذمہ دار ہوں تو عورتیں بھی اس جماعت کی
اسی طرح رکن بن سکتی ہیں۔ اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنی استعداد کو قانونِ خداوندی
کے مطابق استعمال کریں تو یہی صلاحیت عورتوں میں بھی ہے۔ اگر مرد اپنے دعویٰ ایمان کو سچ

کر دکھانے کے اہل ہیں، تو عورتیں بھی اس کی اہل ہیں۔ اگر مرد ثابت قدم رہ سکتے ہیں تو عورتیں بھی رہ سکتی ہیں۔ اگر مرد اس خصوصیت کے حامل ہیں کہ جوں جوں ان کی صلاحیتیں بڑھتی جائیں گی وہ شاخِ ثمردار کی طرح قانونِ خداوندی کی اطاعت میں جھکتے چلے جائیں تو یہ خصوصیت عورتوں میں بھی ہے۔ اگر مرد اپنے آپ پر ایسا کنٹرول رکھ سکتے ہیں کہ انہیں جہاں سے روکا جائے رک جائیں تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے اگر مرد قانونِ خداوندی کو شعوری طور پر سمجھنے اور اسے ہر وقت پیشِ نظر رکھنے کے اہل ہیں تو عورتوں میں بھی اسکی اہلیت ہے۔ جب یہ صلاحیتیں دونوں میں موجود ہیں تو انکے نتائج بھی دونوں کے لئے یکساں طور پر ہونے چاہئیے۔ لہٰذا نظامِ خداوندی میں دونوں کے لئے حفاظت کا سامان اور اجرِ عظیم موجود ہے" $\frac{33}{35}$

میرے عزیز ساتھیو! قرآن کی ان بالیدگیوں پر غور کریں اور پھر سوچیں کہ زندگی کا وہ کون سا گوشہ ہے جس کے متعلق یہ کہا گیا ہو کہ مرد میں تو اس کی صلاحیت ہے لیکن عورت میں نہیں۔ مرد تو یہ کر سکتا ہے لیکن عورت نہیں۔ مرد تو یہ بن سکتا ہے لیکن عورت نہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ مرد اور عورت کے صلاحیت بخش اعمال نتیجہ خیز ہوں گے اور دونوں دوش بدوش جنت میں داخل ہوں گے۔

برادرانِ عزیز! اس میں شبہ نہیں کہ تقسیم کار کی رُو سے زندگی کے کچھ وظائف ایسے ہیں جو عورتوں کے لئے مخصوص ہیں۔ بچے کی پرورش، تعلیم و تربیت۔ بچے کے لئے پیار کا جذبہ اور ایثار و قربانی کی صلاحیت ایک عورت میں ہے اس قسم کی دیگر خصوصیات ہیں جن میں عورت منفرد ہوتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس میں زندگی کے دوسرے گوشوں میں کار فرمائی کی صلاحیت نہیں۔

"قرآن مبین نے امت مسلمہ کا سب سے اہم فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرار دیا ہے اس میں مرد اور عورت دونوں برابر کے شریک ہیں۔"

سورۂ توبہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

"مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق اور دوست ہیں۔ یہ دونوں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ نظامِ صلوٰۃ قائم کرتے ہیں۔ جنہیں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے سایۂ عاطفت میں رکھے گا۔" $\frac{9}{71}$

برادرانِ عزیز! جہاں تک مردوں اور عورتوں کے حقوق کا تعلق ہے۔ قرآن مبین نے اس عظیم حقیقت کو چار الفاظ میں اس جامعیت سے سمٹا کر رکھ دیا ہے کہ بصیرت اس پر وجد کرتی ہے۔

سورۃ البقرہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

جس قدر عورتوں کی ذمہ داریاں ہیں اسی قدر ان کے حقوق ہیں۔ یعنی جو بھی ذمہ داری ان پر عائد کی جائے اس کے مقابل ان کا ایک حق ثبت ہو جاتا ہے۔ "۲/۲۲۸

میری عزیز بہنو اور بھائیو! فرمائیے اس سے بڑھ کر مساوات کیا ہو سکتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے تقسیم کار کی رُو سے مرد کی بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ عورت کام نہیں کر سکتی اور نہ اسے حقوقِ ملکیت حاصل ہے۔

سورۃ النساء میں ارشادِ ربانی ہے۔

"ایک دوسرے کے حقوق کی حفاظت کے سلسلے میں اس غلط تصور کا ازالہ بھی ضروری ہے جس کی رُو سے سمجھا جاتا ہے کہ حقوق ملکیت صرف مرد کو حاصل ہیں عورت کو نہیں۔ عورت اپنے مال و جائیداد کی خود مالک ہوتی ہے۔ مرد اور عورت دونوں اکتساب رزق کر سکتے ہیں۔ "۴/۳۲

برادران گرامی قدر! ان آیاتِ قرآنی کی روشنی میں آپ غور کیجیے کہ قرآن نے عورتوں کو مردوں سے کسی لحاظ سے پست درجہ پر نہیں رکھا۔ لیکن انتہائی بدقسمتی کی بات ہے کہ ہمارے ہاں جو خیالات عورت کے متعلق رائج ہیں، اور جنہیں قوانین شریعت کہہ کر پکارا جاتا ہے، وہ یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں سے مستعار لئے گئے ہیں۔ قرآن کا دامن ان سے پاک و صاف ہے۔

قرآن نے مرد اور عورت دونوں کی تخلیق کو مقصود بالذات کہا ہے۔ یہ دونوں خدا کے پروگرام کو پورا کرنے کے یکساں ذرائع ہیں۔ قرآن کے آئینہ میں یہ ہے عورت کا مقام۔ لیکن ہمارے ہاں کی عورت کے دل میں یہ خیال کوٹ کوٹ کر بھرا گیا ہے کہ اس کی تخلیق مقصودِ بالذات نہیں بلکہ مردوں کے لئے ہے۔

میری عزیز بہنو! ذرا قرآن کی ان باریکیوں پر غور کرو جہاں خدا نے عورتوں سے کہا ہے کہ تم زندگی کے کسی شعبہ میں مردوں سے پیچھے نہیں ہو تو یہ خیال ہمارے دل میں کیوں کر جاگزیں ہوا کہ ہم مردوں سے فروتر ہیں۔ قرآن نے مردوں اور عورتوں کو بارگاہِ حیات میں یکساں صلاحیت کا مالک ٹھہرایا ہے۔ پھر ہمارے دل میں یہ پست خیال کیوں۔ کیا یہ سوچنے کی بات نہیں۔ اس کے باوجود جو عورتیں اپنے دل سے اس پست خیال کو نکال سکیں تو اللہ تعالیٰ ان سے کہتا ہے۔

سورۃ الاعراف میں ارشادِ ربانی ہے۔

"ہم تو چاہتے ہیں کہ تمہیں قرآن کے ذریعے آسمان کی بلندیوں پر لے جائیں لیکن تم ہو کہ اپنے پست جذبات کے پیچھے لگ کر زمین کی پستیوں کے ساتھ چپکے رہنا چاہتے ہو۔ "۷/۱۷۶

آپ کی بیٹی
خالدہ
گجرات

(یہ مقالہ عزیزہ خالدہ کے کنونشن میں نہ پہنچ سکنے کی وجہ سے پڑھا نہ جا سکا)

طلوع اسلام کنونشن ۱۹۸۷ء میں پیش کیا گیا مقالہ

نظامِ حکومت

پچھلے دنوں کراچی میں کچھ ایسے بھیانک فسادات ہوئے کہ سبھی چونک پڑے۔ مسلمانوں نے مسلمانوں کے گھروں اور دکانوں کو آگ لگادی، جلتے ہوئے مکانوں میں بے بس عورتیں، بوڑھوں اور پھول سے بچوں کو پھینک کر بھسم کر ڈالا۔ اغوا کی وارداتیں ہوئیں۔ آبروریزیاں ہوئیں۔ ہر وہ بات ہوئی جو نہ ہونی چاہیئے تھی۔ ۱۹۴۷ء کے ہندو مسلم فسادات کا نقشہ کھنچ گیا۔

اسباب کی کھوج ہوئی، حکومت نے ملک بھر سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر دانشوروں کو بلایا۔ انہیں مختلف گروہوں میں بانٹ دیا اور دعوتِ فکر دی۔

حکومت کی نااہلی، نئے کے تاجروں کی کارستانی، اسلحے کے سوداگروں کی شقاوت قلبی، قومیتوں کا اختلاف، افغان مہاجرین کا مسئلہ، چھوٹے صوبوں میں احساس محرومی، سیاسی اختلافات، اسلامی نظام کے قیام میں تاخیر، غیر ملکی ایجنٹ، طویل فوجی حکومت سبھی کو موردِ الزام گردانا گیا۔

اندھوں نے ہاتھی دیکھا، سبھی کا خیال مختلف تھا مگر سبھی سچے تھے۔ اسی طرح ہمارے سبھی دانشور سچے تھے۔

اتنے بھیانک حالات اور ان کی اتنی ڈھیر سی وجوہ اور سبھی درست، آخر یہ ہمارے ملک کو کیا ہو گیا ہے، ہماری قوم کو کیا روگ لگ گیا ہے۔

ہماری قوم! یہ میں نے کیا کہہ دیا، ہماری کون سی قوم ہے؟ جب ہم تحریکِ آزادی کے لئے نکلے تھے، جب ہم نے اپنے حق خود داری کو استعمال کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا تو ہم نے کہا تھا ہندوستان میں دو قومیں بستی ہیں، ہندو اور مسلمان، ہم مسلمانوں کو علیحدہ اپنا وطن درکار ہے، اس مطالبے میں سبھی شامل تھے۔ سندھی، بنگالی، بلوچی، پٹھان پنجابی ——— ہی نہیں مدراسی، آسامی، بہاری، یوپی۔ سی پی تک کے مسلمان، سبھی یک آواز تھے۔ ہم مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ قومیں نسل، رنگ، زبان کی بنا پر نہیں عقیدے کے اشتراک سے بنتی ہیں۔

ہم متحد تھے، ہماری ایک آواز تھی۔ ہم نے اپنا مطالبہ منوالیا، اپنا الگ وطن لے لیا۔

چند سال پہلے ایک روسی پروفیسر صاحب نے پاکستان میں بسنے والی قومیتوں کا ذکر چھیڑا۔ ان کی ریسرچ ان گروہوں کی نشاندہی تھی جو اسے خطے میں آباد ہیں، ان کے حواری ان کی بات لے اُڑے۔ موقع بے موقع قومیتوں کا ذکر ہوا مگر بات آگے نہ چلی تا آنکہ چند سال بعد مشرقی پاکستان والوں نے فوج کے بل پر مغربی پاکستان والوں کی بالادستی سے تنگ آکر یہ نعرہ لگایا کہ مغربی پاکستان ہمیں لوٹ رہا ہے۔ حکومت میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں، ہمیں نو آبادی بنا لیا گیا ہے۔ مغربی پاکستان میں پنجاب سب سے بڑا صوبہ تھا۔ فوج میں اکثریت پنجابیوں کی تھی، حکومت فوج کے ہاتھ میں تھی؛ اس لئے سارا الزام پنجاب پر آیا اور پنجابی ہونا مشرقی پاکستان میں گالی بن گیا۔ مشرقی پاکستان کی غربت کو اچھالا گیا۔ پنجاب کی خوشحالی کا پراپیگنڈا کیا گیا ——— مغربی پاکستان کے ہاتھوں لوٹے جانے کا نعرہ لگا کر مجیب الرحمٰن کے ذریعے پاکستان دشمن طاقتوں نے بنگالی عوام کے جذبات کو ابھارا اور جب جذبات کی آگ بھڑک اٹھے تو عقل و ہوش رخصت ہو جاتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بنگال کا وہ حصہ جو پاکستان بنا، بے حد غریب تھا، مگر اس میں پاکستان کا کوئی قصور نہ تھا۔ یہ انگریز کے طویل استحصال اور لوٹ مار کا نتیجہ تھا۔ اس کی پالیسیوں کا ثمر تھا۔ غربت مغربی پاکستان میں بھی کم نہ تھی۔ استحصال یہاں بھی کم نہ تھا مگر اپنی تحریک کو غربت کے خلاف جنگ کا رخ دینے کی بجائے اسے علاقائی رنگ دیا گیا ——— ایوب کے دور میں صنعتی ترقیوں کا بڑا چرچا رہا۔ مشرقی پاکستان میں بھی صنعتیں قائم ہوئیں نئے نئے پراجیکٹس بنے۔ بلند و بالا عمارتیں استوار ہوئیں۔ ایوب کے حامیوں نے اس ترقی کا واسطہ بھی دیا لیکن جب بات حاکمیت اور محکومیت کا رنگ اختیار کر جائے تو تاریخ گواہ ہے محکوموں نے ہمیشہ ترقی، خوشحالی، مراعات کو رد کر کے آزادی کو ترجیح دی ہے خود قائداعظم کو بیورلے نکلس نے پاکستان کی معاشی اور اقتصادی حالت کے حوالے سے یہ کہنا چاہا تھا کہ کیا ہندوستان میں مسلمان زیادہ خوشحال نہ ہوں گے ——— تو قائداعظم نے فوراً جوابی سوال کیا تھا۔ کیا تم ایک مفلوک الحال مگر آزاد برطانیہ کے باشندے کہلانا پسند کرو گے یا ہٹلر کے غلام خوشحال برطانیہ کے!

بنگالیوں نے پاکستان دشمن طاقتوں کی مدد سے آخر کار مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنا لیا۔

اب پھر طویل فوجی آمریت کے نتیجے میں قومیتوں کے نعرے سننے میں آرہے ہیں اور محرومیوں کو اس کی وجہ قرار دے کر ترقیاتی سکیموں کا غلغلہ بلند کیا جا رہا ہے۔ زیادہ نوکریوں اور نئی آسامیوں کا لالچ دیا جا رہا ہے لیکن اصل اسباب پر توجہ نہ دی گئی تو آپ اربوں ڈالر خرچ کر کے بھی جی ایم سید، ممتاز بھٹو اور پیرزادہ کے اثر کو زائل نہیں کر سکتے۔

جب پاکستان مانگا جا رہا تھا اسوقت کسی کو ان قومیتوں کا خیال کیوں نہ آیا۔ اسی سندھ نے، اسی سید نے

سب سے پہلے سندھ اسمبلی سے پاکستان کے حق میں فیصلہ دیا۔ بنگال اس کے بعد ساتھ آیا۔ ——— ہاں ایک باچاخان نے پختون قوم کا ذکر ضرور کیا۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ یہی باچاخان جو سندھیوں۔ بلوچوں، پنجابیوں اور بنگالیوں کے ساتھ ملکر ایک پاکستانی قوم بننے پر رضامند نہ تھے۔ انہی لوگوں کے ساتھ ملکر ہندوستانی قوم بننے کو تیار تھے۔ اگر یہ لوگ مدراسیوں، اسامیوں، مرہٹوں، تاملوں بھیلوں اور گونڈوں کے ساتھ ملکر ایک قوم بننے کو تیار ہوں مگر مسلمانوں کی متحدہ آواز کے سامنے ان کی دال نہ گلی۔

اور اس دور ایک نئی قومیت وجود میں آئی ہے ——— شاید اس لئے کہ دین کے پانچ ارکان ماننے والی یہ قوم چار قومیتوں پر اکتفا نہ کر سکتی تھی۔ اس لئے مہاجر قومیت ملک کی پانچویں قومیت قرار دی گئی۔

میں صدیوں پرانی بات نہیں کروں گا۔ اسلام کا واسطہ بھی درمیان میں نہ لاؤں گا کہ شاید پریشان خواب من از کثرت تعبیرہا۔ تاریخی لحاظ سے نسبتاً نئی بات ہے کہ امریکہ میں برطانوی، ڈچ۔ جرمن۔ فرنچ۔ ہسپانوی اطالوی، سبھی گئے اور جاکر بس گئے، اب کوئی نہیں کہتا کہ ہم ڈچ ہیں یا جرمن ہیں یا فرنچ ہیں۔ سبھی امریکی کہلاتے ہیں اور اپنی شناخت امریکی ہی کی حیثیت سے کراتے ہیں حالانکہ ان کے ہاں اتنی بڑی Cementing Force نہیں تھی جتنی آپ کو میسر تھی آپ ایک ایسے دین کے پیرو ہیں جو قاطع رنگ و نسب و نسل ہے پاکستان نے اپنی عمر کا آدھے سے زیادہ حصہ فوجی آمریت تلے گزارا ہے۔ ساری دنیا میں فوجی آمروں کا ایک ہی عذر ہوتا ہے کہ قوم تباہی کے دھانے پر پہنچ چکی تھی۔ ہم آگے نہ آتے تو خانہ جنگی ہوتی۔ کشت و خون ہوتا۔ مگر نتیجہ ہمیشہ اس گرفت کا الٹا ہی نکلا ہے۔ ایوبی آمریت کا آخری نتیجہ بنگلہ دیش کی صورت میں ظاہر ہوا ——— اور اب یہ نئے فتنے سر اٹھانے لگے ہیں اور اس مارشل لاء نے تو نئے نئے ISSUES کھڑے کر دیئے ہیں۔

جمہوریت۔ اسلامی طرز کی حکومت ہے یا نہیں۔ اسلام میں الیکشن جائز ہیں یا نہیں اسلام میں پارٹیوں کا وجود ہو سکتا ہے یا نہیں۔ شورائیت کیا ہے؟ اسے قائم کرنے کا طریق کیا مروجہ الیکشن ہو سکتے ہیں یا غیر جماعتی الیکشن اسلام۔ اسلام۔ اسلام، اسلام کا ذکر اس کثرت سے ہوا کہ ہم نے اس کے صدقے اس مارشل لاء کو بھی گلے سے لگائے رکھا۔

دم تنبیہ ترا ذکر کیا ناصح نے ——— دیر تک ہم نے اسے پاس بٹھائے رکھا

اور مفتیوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اسلام میں پہلا مارشل لاء حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے لگایا حالانکہ جنہوں نے اسے قانونی طور پر جائز قرار دیا تھا ——— نظریہ ضرورت کے تحت ہی سہی -- -- -- --

اب اسے مستحسن نہیں گردانتے ——— بر ایں عقل و دانش بباید گریست

مگر کیا اسلام کا دم بھرنے والے اس عرصے میں اسلام ہماری زندگیوں میں رچ بس گیا؟ اسلام تو قلوب کو جوڑنے کا نام تھا۔ یہ تو مومنوں کی صفوں کو سیسہ پلائی دیوار بناتا تھا ——— مگر یہاں تو حال یہ ہے کہ ہم نسلی اور لسانی گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ہم سندھی ہیں، پنجابی ہیں۔ ہم بلوچ ہیں۔ ہم پختون ہیں۔ ہم مہاجر ہیں کوئی اپنے آپ کو مسلم یا مومن نہیں کہتا۔ کوئی سنی ہے۔ کوئی شیعہ ہے۔ کوئی وہابی ہے۔ کوئی دیوبندی ہے۔ کوئی بریلوی ہے ——— ان اضافتوں کے بغیر کوئی اپنا تعارف مکمل نہیں سمجھتا۔

قوم ایک ہونے کی بجائے لخت لخت ہو کر رہ گئی ہے۔ ٹکڑوں میں بٹ گئی ہے، فرقہ فرقہ ہو گئی ہے اور سارے کے سارے فرقوں کی باچھیں کھلی ہوئی ہیں۔ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ——— کہ اسلام آ گیا ہے۔ حالانکہ ایسی قوم کے متعلق جسمیں تفرقہ ہو جو فرقوں میں بٹی ہوئی ہو۔ قرآن پاک میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیا گیا کہ آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ لست فی شیء۔

لیجیے قصہ تمام، جسکی سنت کا آپ دم بھرتے ہیں قرآن پاک تو کہتا ہے اُن کا تم سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

سو میری عرض تو ملت اسلامیہ پاکستانیہ سے یہی ہے کہ پہلے فرقوں کو خیرباد کہہ کے مسلم بن کر حضور سے تعلق تو پیدا کر لیں۔ قربت کا دعوے تو بعد کی بات ہے۔ اسلامی اور غیر اسلامی کی بحث بھی بعد میں ہو سکتی ہے۔ موجودہ حالت میں تو ہم اس بحث میں حصہ لینے کے حقدار ہی نہیں۔ جس ہجوم بندگاں کا نبی اکرمؐ سے تعلق نہیں وہ اس دین کا دم کیسے بھر سکتے ہیں۔ ——— آپ جو چاہیں کہیں۔ جو چاہیں کریں۔ پارلیمانی نظام اپنائیں صدارتی آزمائیں۔ شورائی ڈھانچہ کھڑا کریں۔ نامزدگیاں کریں۔ الیکشن کرائیں جماعتی یا غیر جماعتی اور انفرادی جو جی میں آئے کریں اپنے کسی فعل کو اسلامی نہیں کہہ سکتے۔

——— اور آپ نے یہ سب کر کے دیکھ لیا، بنیادی جمہوریتوں کا تجربہ کیا، صدارتی نظام آزمایا۔ جماعتی الیکشن مروجہ طریقوں سے کرایا (اور اس کے نتیجے میں ملک کا ایک بازو کٹتے دیکھ لیا۔) نامزد مجلس شوریٰ کا مزہ بھی چکھ لیا۔ غیر جماعتی الیکشنوں کا ڈرامہ بھی دیکھ لیا۔ لوگ نسلی اور علاقائی تعصب سے ایک قدم آگے بڑھ کر براہ راست کا دم بھرنے لگے۔ اپنے آپ کو سندھی اور پنجابی ہی نہیں ارائیں، راجپوت اور کشمیری کہلانے میں فخر محسوس کرنے لگے۔

فکری انتشار اور بھانت بھانت کی بولیوں سے بچنے کے لئے اسمبلی کے اندر ایک سرکاری جماعت بنا کر فلور کراسنگ پر پابندی عائد کرنے میں عافیت سمجھی۔ نامزد وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ اس جماعت کے بھی سربراہ بنائے گئے اور انتظامیہ کو حکومت کے ساتھ ساتھ اس پارٹی کے بھی تابع کر دیا۔ کل تک جو پارٹی سازی کو خلاف اسلام کہتے تھے آج کیوں اس غیر اسلامی قدم اٹھانے پہ مجبور ہو گئے۔ کیا مجبوری آن پڑی ——— کل تک

تو آپ اس ساری مغربی جمہوریت ہی کو خلافِ اسلام قرار دے کر شورائی نظام کے نام لیوا تھے۔ بلکہ معاشرے سے اپنی مرضی کے لوگ ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک مجلس شوریٰ نامزد بھی کر دی تھی اور شاورھم فی الامر کا سہارا لے کر پارلیمنٹ کو مجلس شوریٰ کا نام دے دیا تھا۔ لیکن کسی چیز کو نیا نام دینے سے اس کی اصلیت تو نہیں بدل جاتی۔ سود کو منافع یا رائٹ اپ کہہ دینے سے وہ حلال تو نہیں ہو جاتا۔ یہ اسلامائزیشن بھی عجیب لفظ ہے ——— بھئی ایک چیز یا اسلامی ہے یا نہیں ہے۔ ایک غیر اسلامی شے کو نیا پینٹ دے کر، کسی بھی پودے میں ڈھانپ کر آپ اسے کیسے اسلامی کہہ سکتے ہیں؟ اسلام کا ہر شے کا اپنا نظام ہے۔ انڈین پینل کوڈ، انڈین پینل کوڈ ہے، اسلامی نظامِ عدل اسلامی نظامِ عدل ہے۔ کوئی ترمیم اسے اسلامی نہیں کر سکتی۔

خدارا کہیں تو رُک کر سوچئے آپ کہاں غلط ہیں۔ آپ نے نبی اکرمؐ کی اس بات پہ بھی کبھی غور کیا ہے جو زبانِ وحی سے کہلوائی گئی ——— قل انما اعظکم بواحدۃ ... ثم تتفکروا (۳۴/۴۶) کبھی تو خدا کے حضور جھک کر خشوع و خضوع سے کہئے ——— اھدنا الصراط المستقیم اگر آپ نے یہ طریقہ اختیار کیا تو آپ پہ راہیں روشن ہو جائیں گی۔ آپ مزید اندھیروں میں بھٹکنے سے بچ جائیں گے۔

آپ نے کبھی یہ سوچا کہ شاورھم فی الامر کن کے لئے کہا گیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی سیرتوں کی تکمیل خود سایۂ نبوتؐ میں ہوئی تھی، جن کو خود حضورؐ نے کتاب و حکمت کی تعلیم دی تھی، جن کی صلاحیتوں کی نشوونما خود حضورؐ نے کی تھی۔ کسی نے کبھی اس پہ بھی غور کیا کہ اسلام کا مقصود انسان سازی ہے (آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا) فرد کی ذات کی نشوونما کرنا اور پھر ان نشوونمایافتہ لوگوں کی اجتماعی کوششوں اور کاوشوں سے استحصال سے پاک معاشرے کا قیام ہے۔

ایسے نشوونمایافتہ انسانوں کے معاشرے میں آپس کے مشورے کے لئے وہ باہم مل بیٹھ کر کوئی بھی طریقہ اختیار کر سکتے ہیں۔ کوئی بھی مشینری اس کے لئے تجویز کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی پارلیمنٹ بالغ رائے دہی کے مروجہ نظام کے تحت بھی بنا سکتے ہیں۔ یہ نظام پارلیمانی بھی ہو سکتا ہے۔ صدارتی بھی ——— صدارتی ہو یا پارلیمانی قرآن کی حدود کے اندر رہے گا ——— اسی لئے اسنے تزکیۂ نفس پہ تو زور دیا ہے۔ انسان سازی پہ تو زور دیا ہے۔ چناؤ کے طریقے کا تعین نہیں کیا۔

پاکستان بننے کے بعد کرنے کا کام تو یہ تھا کہ بندگانِ خدا کو ان ارضی خداؤں، ان اجارہ داروں کے چنگل سے آزاد کرایا جاتا جو ان کی محنت کا استحصال کرتے ہیں

دانہ آں می کارد ایں حاصل بہ د

اتفاق سے پاکستان کا موجودہ خطہ انہیں دو خداؤں کی اجارہ داریوں کی سرزمین ہے۔ وسیع خطہ ہائے

زمین، گاؤں کے گاؤں انہی جاگیردار خاندانوں کی ملکیت ہیں جن کے آباؤ اجداد کو غیر ملکی حاکموں نے انہیں ان کی وفاداریوں کے عوض دے دیا تھا، کیا یہ غیر ملکی حاکم اس زمین کے مالک تھے جو انہوں نے اسے اپنے وفاداروں میں بانٹ دیا۔ جب دینے والا ہی غیر قانونی ہو تو جسے یہ زمین دی گئی کیسے قانونی مالک ہو گیا اور پھر جب یہ دینے والا رخصت ہوا تو یہ عطا خود بخود ختم ہو جانی چاہیے تھی۔

اور مالک تو زمین کا خود اللہ ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی کا خود کو زمین کا مالک قرار دینا شرک نہیں تو اور کیا ہے۔؟

بھارت نے تمام راجوں۔ مہاراجوں، راجواڑوں کی ریاستیں ختم کیں۔ پاکستان میں بھی چند ریاستوں کو ختم کر کے پاکستان میں مدغم کر دیا۔ بھارت میں جاگیریں بھی ختم کر دی گئی مگر پاکستان میں ایسا نہ ہوا۔ یہ جاگیردار یا چھوٹے پیمانے پہ ریاستیں نہیں تو اور کیا ہیں، جہاں یہ جاگیردار۔ یہ وڈیرے۔ یہ سردار اور یہ خان اپنی خدائی قائم کیے چھوٹے پیمانے پہ فراعین بنے ہوئے ہیں جو دن رات اپنے انا ربکم الاعلیٰ ہونے کا عملاً اعلان کرتے رہتے ہیں۔ جسے چاہیں اپنے علاقے میں رہنے دیں۔ جسے چاہے نکال دیں۔ جسے چاہیں عرصۂ حیات تنگ کر دیں، جن کی اجازت کے بغیر ان کے علاقے سے کوئی سرکاری ایجنسی مجرم تک کو ہاتھ نہیں لگا سکتی۔

جب بلوچستان کے سرداری سسٹم پہ ہاتھ ڈالا گیا تو اندرون اخبارات میں ان سرداروں کی بنائی ہوئی ذاتی جیلوں میں دس دس بیس بیس سال سے زنجیروں سے بندھے قیدیوں کی تصویریں اخبارات میں آئی تھیں۔

یہ لوگ اور ان کی اولاد ہی سب ملکی وسائل پہ قابض رہی، یہی لوگ تعلیم حاصل کر کے سرکاری افسر بنے۔ انہی میں سے فوج کے افسر بنے۔ انہی کے ساتھی پیسے کے زور پر اسمبلیوں میں پہنچ کر وزیر اور قانون ساز ہوئے، کہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے قانون سازی کریں۔

خود ہی قاتل خود ہی مصنف والا معاملہ ٹھہرا۔ آزادی اور اس کے ثمرات عام آدمی تک کہاں پہنچے ہیں، یہاں تو

کہاں سے آئی نگار صبا کدھر کو گئی ابھی چراغ سر راہ کو خبر ہی نہیں

والا معاملہ ہے۔

ضرورت تھی اس پاک سرزمین سے زمین کی ملکیت کا شرک مٹا کر، سب کو برابر قرار دے کر اسلامی مساوات کی بنیاد پہ معاشرے کی تعمیر شروع کی جاتی، سب کو یکساں مواقع میسر ہوتے۔ ہر کوئی اپنی صلاحیت کے بل پہ آگے بڑھتا۔ ہر کسی سے انصاف ہوتا۔ کسی کی حق تلفی نہ ہوتی۔

بخدا اس زمین کے اندر اتنے خزانے تھے۔ اس خطے کے باسیوں میں اتنی صلاحیتیں تھیں کہ یہاں دولت کے

ڈھیر ہوتے۔ یہاں ایک عبدالقدیر نہیں، سینکڑوں بلکہ ہزاروں عبدالقدیر ہوتے، علم و فلسفے میں طب و سائنس میں، فنون میں۔ ہر چیز میں، اقوام عالم میں ہمارا مقام ہوتا۔ بلکہ ہم ان کے راہنما ہوتے ——— مگر ہم نے تو کفر کی روش اپنا رکھی ہے۔ (سورۂ محمدؐ الذین کفروا یتمتعون ویاکلون کما تاکل الانعام والنار مثوی لھم ۴۷/۱۲)

اور مومنین والے انعامات کے متمنی ہیں۔ ——— مگر قدرت کے تو اپنے قانون ہیں اور وہ انہیں کسی سے بھی رعایت نہیں کرتی۔

خدا لگتی کہیئے کیا آج بھی وہی خاندان تعلیم، انتظامیہ، فوج، مقننہ، عدلیہ، ہر شے پہ قابض نہیں جو چالیس سال قبل تھے ——— جب کبھی اقتدار ان کے ہاتھ سے کھسکتا نظر آیا، وہ کوئی نہ کوئی چال چل جاتے ہیں، کبھی فضل الحق کو غدار قرار دے کر مسند سے ہٹا دیا۔ کبھی مجیب کو محب وطن قرار دے کر برابر بٹھا لیا۔

مشرقی پاکستان والوں نے بغاوت کی تو اس لئے نہیں کہ وہ وہاں اسلام کا عادلانہ نظام قائم کرنے کے متمنی تھے۔ انہوں نے مغربی پاکستان والوں کی لوٹ کا واویلا اس لئے مچایا کہ مغربی پاکستان کے سرمایہ داروں کے سامنے ان کے اپنے سرمایہ داروں کا چراغ نہیں جل پاتا تھا ——— اور آج بھی کوئی پختون علاقے اور پختونوں کے حقوق کی بات کرتا ہے تو پتھروں پہ چلنے والے ننگے پاؤں مزدور کے فائدے کے لئے نہیں۔ کوئی مہران کی محرومیوں کی داستانیں اچھالتا ہے تو غریب ہاریوں کو زمینوں کا مالک بنا کر ان کے بچوں کو برابر کے مواقع دلانے کے لئے نہیں بلکہ ان کا خون چوسنے کے لئے اپنی اجارہ داری منوانے کے لئے۔

مسئلہ علاقوں کا نہیں۔ عام آدمی کے حقوق کا ہے۔ اس کے لئے سارا نظام بدلنا ہوگا۔ ایسا نظام قائم کرنا پڑے گا۔ جس میں ہر سندھی، ہر بلوچی، ہر پٹھان، ہر پنجابی کو یکساں مواقع میسر آئیں۔ ہر ایک کو اپنی صلاحیتوں کے بل پہ آگے بڑھنے کی آزادی ہو۔ ہر ایک کے حقوق محفوظ ہوں۔ کسی کو کسی سے ظلم اور بے انصافی کا دھڑکا نہ ہو۔

موجودہ معاشرے میں ہاریوں کی نمائندگی زمیندار کرتا ہے۔ مزارعوں کا نمائندہ وڈیرہ، جاگیردار، سردار یا خان ہوتا ہے۔ مزدوروں کی نمائندگی کارخانہ دار کرتا ہے۔ آپ الیکشن پارٹیوں کا پابند کرائیں یا پارٹی لیس۔ صحیح نمائندے منتخب نہیں ہو سکتے۔ عوامی بہتری کے قانون بن ہی نہیں سکتے، کون اپنے پاؤں پہ خود کلہاڑی مارتا ہے۔ طرز حکومت پارلیمانی اپنائیں یا صدارتی غریب آدمی کے دن پھر ہی نہیں سکتے۔

ایسا معاشرہ قائم کرنا ہوگا جس میں کوئی کسی کا دست نگر نہ ہو، محتاج نہ ہو، مجبور اور بے بس نہ ہو۔ دل کی بات

(باقی ۴۴ پر)

حسن عباس رضوی

پیکرِ استکبار کی فسوں سازیاں

کیا امامانِ سیاست، کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے مری ایک ہُو

انسانی راہنمائی

جونہی انسان میں تمدنی شعور پیدا ہوا اور اس نے معاشرتی زندگی کا آغاز کیا تو اللہ تعالیٰ نے سفرِ حیات میں ان کی راہنمائی کے سلسلہ میں انبیاءِ کرام کی بعثت کا آغاز کیا تاکہ ان کی وساطت سے ہدایت کا ایسا سرمایہ ان تک پہنچتا رہے کہ وہ ہر طرف سے صَرفِ نظر کر کے صرف اسی کو زادِ راہ بنائیں۔ اور ایک توازن بدوش راہ (الصّراطِ مستقیم) پر گامزن ہو کر مقصود کو حاصل کرلیں۔ جن کی سمجھ میں بات آگئی انہوں نے تو اس نعمت کو سینہ سے لگا لیا۔ لیکن ایک بڑا طبقہ ایسا تھا جن کی چودھراہٹ ختم ہوتی تھی۔ انہوں نے اسے اپنی اَنا کا مسئلہ بنا لیا اور اس کے راستے میں سنگِ گراں بن کر بیٹھ گئے اور اس کی مخالفت میں متعدد محاذ کھول لئے۔ اس داستانِ تسلیم ورضا اور استکبار و استکراہ کی تاریخی یادداشتیں قرآنِ حکیم نے محفوظ کر رکھی ہیں ۲۴/۴۴ جن کی مدد سے یہ جاننا آسان ہو جاتا ہے کہ ماضی میں قانونِ الٰہی کے نفاذ میں کون کون سی قوتیں مزاحم اور حائل ہوئیں اور کسطرح سے ان کو راستہ سے ہٹا دیا گیا ۱۵/۷۶-۷۹، ۲۱/۱۵ اور اس کی روشنی میں لوگ یہ اندازہ بھی لگا سکیں کہ ان کے مروجہ نظام کس قدر قوانینِ الٰہی سے ہم آہنگ ہیں یا کہ قدرِ باطل کی قوتوں کے ساتھ مربوط ہیں۔ یہ ایک ایسا آئنہ ہے جو بولتا ہے اور کہتا ہے فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ۵۴/۱۷، کوئی ہے؟ جو نصیحت پکڑے اور اپنا قبلہ درست کرلے۔"

اب ہم اس چیز کا جائزہ لیں گے کہ باطل قوتیں عوام پر کس طرح آکاس بیل کی طرح گرفت کئے ہوئے ہوتی ہیں۔ جس سے ان کی خداداد صلاحیتیں دب کر رہ جاتی ہیں اور ان کو ایسا ماحول میسر نہیں آسکتا جس میں ان کی صلاحیتوں کی (ACTUALISATION) اور (MANIFESTATION) ہوسکے اور اس طرح وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کے دستِ نگر اور آلۂ کار بنے رہیں۔

کارِ ابلیس

جہاں تک تاریخی یادداشتوں کا تعلق ہے۔ قرآنِ حکیم میں سرِ فہرست بنی اسرائیل کی وہ داستان ہے جو قرآنِ حکیم کے بیشتر حصہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی وسعت اور عمق سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کسطرح عروج و زوال اور اصول و مبادی کا مرقع بن گئی ہے۔ اس داستان میں جہاں اور چیزیں نظر آتی ہیں وہاں ایک نہایت اہم حقیقت سامنے آتی ہے۔ جس کا تعلق نظامِ مملکت سے ہے۔ اگرچہ اسلام ایک مشاورتی نظام

[illegible]یں نظام میں طرز حکومت پر کوئی قدغن نہیں لگائی گئی (کیونکہ یہ بات مشاورتی نظام کے منافی ہے) لیکن [illegible]ں تخت اجلال کو RECOGNISE نہیں کیا جس کے ستون ملوکیت، مذہبی پیشوائیت (THEOCRACY) PRIESTLY HIERARCHY سرمایہ داریت اور پیریت ہیں۔ بنی اسرائیل کی داستان میں [illegible] نمائندہ فرعون مذہبی پیشوائیت کا امام ہامان، سرمایہ داریت کا سربراہ قارون اور پیریت کا سرخیل سامری [illegible]سر یہ قوتیں علیحدہ علیحدہ نظر آتی ہیں لیکن یہ چاروں ابلیسیت کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ یاد رہے ان کے بڑے [illegible]س نے علیحدگی کے وقت خالق کائنات کو یہ چیلنج دیا تھا کہ "میں انسانیت کے راستہ میں غول راہ بن کر بیٹھوں گا (۷/۱۶) [illegible] سیدھے راستے سے بھٹکاؤں گا۔ ان کے آگے سے، پیچھے سے دائیں سے اور بائیں سے ہجوم کر کے آؤں گا (۷/۱۷)، [illegible]ور [illegible] راست سے پھسلاؤں گا۔ گناہوں کو آراستہ کر کے دکھاؤں گا (۱۵/۳۹) اس کی اولاد میں شامل ہو کر ان سے طرح [illegible]ے وعدے کروں گا (۱۷/۶۴) علیٰ ھٰذا القیاس"

[illegible]تنا بڑا چیلنج دے کر ابلیس سو نہیں گیا تھا بلکہ اپنے چیلنج کو عملی شکل دینے کے لئے اس نے دنیا کے مختلف [illegible]ں کا سروے کیا ہوگا۔ جس کے نتیجہ میں اس کے ذہن تجسس سے وساوس وشقاوت کے چار بڑے لاوے پھوٹے [illegible] یہ محیط سیلاب بلا نے انسانیت کو اپنے گھیرے میں لے لیا جس سے باہر نکلنے کے تمام راستے مسدود ہو گئے۔ چار [illegible]ں سے مراد اصل میں وہ چار نظام ہیں جو ابلیس کے ذہن نے تخلیق کئے تھے اور جن کا اس نے تمثیلی انداز سے اس [illegible] ذکر کیا تھا کہ وہ مخلوق خدا کے آگے سے پیچھے سے، دائیں سے بائیں سے ہجوم کر کے آئیگا اور اس کو راہ راست [illegible]ے پھسلا دے گا۔ یہ نظام ملوکیت، مذہبی پیشوائیت، سرمایہ داریت اور پیریت ہیں۔ جن کے سردار فرعون، ہامان [illegible]رون، اور سامری تھے۔

اسطرح ابلیسی نظام پوری طرح قائم ہو گیا جس کے آہنی پنجہ میں تڑپتی پھڑکتی، بلبلاتی انسانیت کو اس جان لیوا [illegible]ذاب سے نجات دلانے کے لئے حضرت ہارونؑ کی معاونت کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کو اس آہنی گٹھ جوڑ کی سرکوبی کے [illegible]لئے مامور کیا گیا۔

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوۡنَ فَقَالُوۡا سٰحِرٌ کَذَّابٌ (۴۰/۲۴)

"اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کو اپنے قوانین اور واضح دلائل کے ساتھ (استبداد وملوکیت اور آمریت کے مجسمے) فرعون، (مذہبی پیشواؤں کے امام) ہامان (اور سرمایہ داری کے نمائندہ) قارون کی طرف بھیجا۔ (چونکہ قانون خداوندی کی زد براہ راست ان تینوں پر پڑتی تھی اس لئے انہوں نے

---

[1] اگرچہ یہ تمثیلی انداز ہے۔

اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ ۴/۱۸

" ان لوگوں کی توبہ توبہ نہیں جو ساری عمر برائیاں کرتے رہے اور جب ان میں سے کسی کے سامنے موت آ کھڑی ہوئی تو کہنے لگا اب میں توبہ کرتا ہوں۔ اس طرح ان لوگوں کی بھی توبہ توبہ نہیں جو کفر کی حالت میں مر جاتے ہیں۔ ان کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

فرعون عذاب الٰہی سے بچ نہیں سکتا تھا۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے اس سے یہ کہا کہ:۔

" فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۝ ۱۰/۹۲

" آج ہم ایسا کریں گے کہ تیرے جسم کو سمندر میں غرق ہونے سے بچا لیں گے تاکہ آنے والی قومیں اس سے عبرت حاصل کریں۔"

یہ ہے انجام فرعون موسیٰ کا جس سے زیادہ پرشکوہ کوئی بادشاہ نہیں گزرا۔ یہی انجام ہوتا ہے سرکش و نافرمان افراد اور اقوام کا۔!!

مذہبی پیشوائیت

قرآن حکیم کی رو سے ہامان، مذہبی پیشوائیت کا امام اور فرعون کا رفیق اعلیٰ تھا۔ آمن رع (سورج کا دیوتا) مصر میں سب سے بڑا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ آمن رع کے مندر کے پجاریوں کا سردار کاہن یعنی اسقف اعظم (HEAD PRIEST) آمن کہلاتا تھا اور یہی آمن قرآن کا ہامان ہے اس کا اصل نام یکن خونس ہے جس کا مجسمہ جرمنی میں ہے۔ اس اسقف اعظم کو فرعون نے کہا تھا:۔

قَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامَانُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝ ۴۰/۳۶ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ۝ (۴۰/۳۷)

فرعون نے کہا " اے ہامان میرے لئے ایک بلند مینار تعمیر کرایا جائے جس پر آسمانوں کی راہ چڑھ کر میں موسیٰ کے خدا کو دیکھ لوں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ جھوٹا ہے۔"

اس بیان سے حیرانی تو ہوئی ہوگی کہ ہامان تو مندر کے پجاریوں کا سردار کاہن تھا لہٰذا مندر کے پجاریوں کا تعمیر سے کیا تعلق؟ لیکن نہیں! قرآن کا یہ بیان غلط نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر سٹینڈرف اپنی کتاب " قدیم مصریوں کا مذہب" میں لکھتا ہے:۔

آمن دیوتا کے سردار کاہن کو بنی اوّل کہتے تھے۔ وہ محکمۂ تعمیرات کا افسر بھی تھا مندر کی عالیشان عمارت اور ان کی زیبائش و آرائش کا انتظام اس کی تفویض میں تھا۔ یہی دیوتاؤں کی فوج یعنی مندر کی سپاہ کا جرنیل بھی تھا۔ خزانہ کی نگرانی اور نظم و نسق کا بھی یہی ذمہ دار تھا۔ نہ صرف آمن کا

اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ ۴/۱۸

" ان لوگوں کی توبہ توبہ نہیں جو ساری عمر برائیاں کرتے رہے اور جب ان میں سے کسی کے سامنے موت آکھڑی ہوئی تو کہنے لگا اب میں توبہ کرتا ہوں۔ اس طرح ان لوگوں کی بھی توبہ توبہ نہیں جو کفر کی حالت میں مر جاتے ہیں۔ ان کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

فرعون عذاب الٰہی سے بچ نہیں سکتا تھا۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے اس سے یہ کہا کہ:-

" فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۝ ۱۰/۹۲

" آج ہم ایسا کریں گے کہ تیرے جسم کو سمندر میں غرق ہونے سے بچا لیں گے تاکہ آنے والی قومیں اس سے عبرت حاصل کر لیں۔"

یہ ہے انجام فرعون موسیٰ کا جس سے زیادہ پرشکوہ کوئی بادشاہ نہیں گزرا۔ یہی انجام ہوتا ہے سرکش و نافرمان افراد اور اقوام کا۔!!

مذہبی پیشوائیت

قرآن حکیم کی رو سے ہامان، مذہبی پیشوائیت کا امام اور فرعون کا رفیق اعلیٰ تھا۔ آمن رع (سورج کا دیوتا) مصر میں سب سے بڑا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ آمن رع کے مندر کے پجاریوں کا سردار کاہن یعنی اسقف اعظم (HEAD PRIEST) آمن کہلاتا تھا اور یہی آمن قرآن کا ہامان ہے اس کا اصل نام یکین خونس ہے جس کا مجسمہ جرمنی میں ہے۔ اس اسقف اعظم کو فرعون نے کہا تھا:-

قَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامَانُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝ ۴۰/۳۶ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ۝ (۴۰/۳۷)

فرعون نے کہا " اے ہامان میرے لئے ایک بلند مینار تعمیر کرایا جائے جس پر آسمانوں کی راہ چڑھ کر میں موسیٰ کے خدا کو دیکھ لوں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ جھوٹا ہے۔"

اس بیان سے حیرانی تو ہوئی ہوگی کہ ہامان تو مندر کے پجاریوں کا سردار کاہن تھا لہٰذا مندر کے پجاریوں کا تعمیر سے کیا تعلق؟ لیکن نہیں! قرآن کا یہ بیان غلط نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر سٹینڈرف اپنی کتاب " قدیم مصریوں کا مذہب" میں لکھتا ہے:-

آمن دیوتا کے سردار کاہن کو بنی اوّل کہتے تھے۔ وہ محکمۂ تعمیرات کا افسر بھی تھا مندر کی عالیشان عمارت اور ان کی زیبائش و آرائش کا انتظام اس کی تفویض میں تھا۔ یہی دیوتاؤں کی فوج یعنی مندر کی سپاہ کا جرنیل بھی تھا۔ خزانہ کی نگرانی اور نظم و نسق کا بھی یہی ذمہ دار تھا۔ نہ صرف آمن کا

مندر اور اس کے پجاری اس کے دائرۂ حکومت میں تھے۔ بلکہ تھیبس اور شمالی مغربی مصر کے تمام منادر کے پجاریوں کا افسرِ اعلیٰ بھی یہی تھا اگر حساب لگایا جائے تو صرف شہر تھیبس کے آمن کے مندر کے قبضہ میں مصر کی زمین کا دسواں حصہ تھا اور کم از کم سویں حصہ آبادی پر اس کی حکومت تھی۔

یہی آمن دیوتا کے مندر کے سردار کاہن (HEAD PRIEST) کی وجاہت وثروت۔ اس بیان سے اگرچہ یہ مترشح ہوتا ہے کہ مذہبی پیشوائیت کی متبادل حکومت قائم تھی لیکن اگر فرعون کو ساتھ جوڑا جائے تو بھی یہاں عملاً مذہبی پیشواؤں کا نظام (PRIESTLY HIEORCITY) قائم تھا۔ گویا تاریخی ادوار میں ہر جگہ بادشاہت کے غلبہ و استیلاء سے کہیں زیادہ عمیق و شدید مذہبی پیشوائیت کا تسلط نظر آئے گا۔ بادشاہت مذہبی پیشوائیت کی مرہونِ منت اور دست نگر تھی۔ بلکہ یوں کہئے حکومت اصل میں مذہبی پیشوائیت کرتی تھی اس کو اس مثال سے سمجھئے کہ جب بھی حضرت موسیٰؑ کا تقابل فرعون سے ہوتا تو وہ خود پردے کے پیچھے چلا جاتا اور ہامان اور مندر کے پجاری مقابلے کے لئے میدان میں آجاتے اور موسیٰؑ کا مقابلہ انہی سے ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ فرعون کیساتھ ہامان کا تار پود دیکھنا بھی ضروری تھا اسطرح وہ بھی اپنی تمام دولت، قوت اور لاؤ لشکر کے باوجود خدا کے قانون مکافات کی گرفت سے نہ بچ سکا۔

سرمایہ داریت

ہامان کی طرح قارون بھی اپنی دولت کے بل بوتہ پر فرعون کا پشت پناہ تھا اس کے پاس اتنی دولت تھی کہ فرعون بھی اس سے مرعوب تھا۔ یہ بھی ہر سرمایہ دار کی طرح یہی کہتا کہ میں نے جو کچھ حاصل کیا اپنے کسب و ہنر کی بناء پہ کیا ہے اس لئے اس میں کسی کا حق نہیں اور نہ ہی اس پہ کسی قسم کی پابندی لگائی جاسکتی ہے۔ اس کی دولت کا یہ عالم تھا کہ اس کے خزانے کی کنجیاں ایک طاقتور جماعت کو اٹھانا مشکل ہو تیں [28/76] یہ اس طبقہ کی نمائندگی کرتا تھا جو عیارانہ چالوں سے رزق کے سرچشموں پہ سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ لوگ روٹی کے محتاج ہو جاتے ہیں اور اس طرح ان کی تمام تر توانائیاں فکرِ معاش میں ضائع ہو جاتی ہیں۔ ان کی رگِ حیات کے اندر سرد پڑ جاتی ہیں اور وہ مستبد حکمرانوں کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں کر سکتے۔ لہٰذا یہ طبقہ ان سے جو کام لینا چاہتا ہے لیتا ہے۔ یہ تذلیلِ انسانیت کی انتہا ہے جسے سرمایہ دارانہ نظام اپنی بقا کا راز سمجھتا ہے اس دور میں زمینداری سسٹم کے ساتھ نظامِ کارخانہ دار (INDUSTRY) بھی سرمایہ داریت کی صف میں کھڑا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے کسان اور مزدور دونوں سرمایہ دارانہ نظام کی زد میں آگئے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کی دعوتِ انقلاب بھی اسی لعنت کے استیصال کے لئے تھی لیکن قارون نے اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا جس کے اس عمل کو اللہ تعالیٰ نے فساد سے تعبیر کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کے مفسدانہ کردار اور نظامِ خداوندی سے بغاوت اور سرکشی کی پاداش میں "قارون اور اس کے بھرے ہوئے گھر کو تباہ کر دیا۔ پھر نہ تو کوئی ایسی جماعت ہوئی جو خدا کے برخلاف اس کی مدد کرتی اور نہ وہ خود ہی

... ذکر نے والوں میں سے ہو سکا (۲۸/۸۱) اور وہ لوگ جو کل اس جیسا ہونے کی تمنا کر رہے تھے کہنے لگے، رزق کی بسط ... قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتی ہے اگر خدا نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہم بھی اسطرح تباہ ہو جاتے۔ ناشکرے ... کبھی فلاح نہیں پاتے۔ (۲۸/۸۱)

سامریت

سامریت اصل کے اعتبار سے مذہبی پیشوائیت یعنی ہامانیت کی بغل بچہ تنظیم تھی جس کے ڈانڈے قارونیت اور ملوکیت سے جا کر ملتے ہیں۔ ہامانیت مستند قسم کی تنظیم تھی اور سامریت قدرے معتدل۔ اول الذکر کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ اگر کہیں پرنسپل تنظیم زیرِ عتاب آجائے تو وہ اس بغل بچہ تنظیم کے لبادے میں اپنا کام سرانجام دیتی رہے۔ اس تنظیم کا سرخیل سمیری قوم کا ایک آدمی تھا جس کا نام سامری تھا اس نے اپنا تسلط قائم کرنے کے لئے شعبدہ بازی کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ ٹونے، ٹوٹکے، تعویذ، گنڈے کے اعمال میں لوگوں کو الجھائے رکھنا یہ ایسی افیون تھی جس سے ندرتِ فکر و جدت کی دار جیسی متاع سلب ہو جاتی اور لوگ مستبد حکمرانوں کے خلاف سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ان کو آزاد فضاؤں سے بیگانہ رکھنے کے لئے خانقاہوں اور مزاروں کے اندر چلہ کشی کا حوصلہ شکن سبق دیا جاتا۔ یہ وہی حربہ تھا جو ابلیس نے اپنے مشیروں کو سکھایا کہ

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے ۔۔۔ تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر ۔۔۔ جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے ۔۔۔ پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

سامری کے سحر کارانہ انداز کی یہ انتہا تھی کہ اس نے لوگوں کو جال میں پھنسانے کے لئے بنی اسرائیل سے سونے اور چاندی کے زیورات جو وہ مصر سے اپنے ساتھ لائے تھے لے اور پگھلا کر ایک بچھڑا بنایا۔ اس بچھڑے کے خالی پیٹ میں کوئی ایسی کل بٹھا دی کہ ہوا کے نفوذ و خروج سے اس سے آواز نکلتی۔ بس کیا تھا بنی اسرائیل نے اس عجوبہ کی پرستش شروع کر دی اور آدابِ شاہ بازی سے ناآشنا ہو گئے۔ وہ یہ بھی نہ سمجھ سکے کہ وہ بچھڑا ان کی بات کا جواب نہیں دیتا۔ ان کے دکھ درد کیسے دور کرے گا۔ ان کی غلامی کی زنجیریں پختہ کرنے کے لئے سامری کا یہ حربہ کامیاب رہا یہ انسانیت پر ایک عظیم ظلم تھا۔

اُس کی ابلہ فریبی کی ایک مثال یہ بھی تھی کہ یہ حضرت موسیٰؑ پر ایمان تو لے آیا مگر جو اس کے اندر چور تھا اس کی وجہ سے وہ حضرت موسیٰؑ کی اتباع میں چند ہی قدم چل سکا اور یہ کہکر جدا ہو گیا کہ "میں نے تمہارے پیغام رسالت کو پورے طور پر اختیار نہیں کیا تھا اس سے محض تھوڑا سا حصہ لیا تھا اور میں نے وہ کچھ بھی بھانپ لیا تھا جو تمہارے قوم کے حیطۂ تصور میں بھی نہ تھا لہٰذا جب میں نے مناسب موقع دیکھا تو اتنے حصہ کو بھی الگ کر دیا۔ میری مفاد پرستیوں نے یہ بات بھی مجھے خوش آئندہ بنا کر دکھائی" اس پر حضرت موسیٰؑ نے سامری سے کہا:۔

قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ أَنْ تَقُولَ لَا مِسَاسَ ص وَإِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهُ ج وَانْظُرْ إِلٰى إِلٰهِكَ الَّذِي ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ط لَنُحَرِّقَنَّهُ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهُ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ۲/۹۷

"اگر ایسا ہے تو یہاں سے نکل جا۔ تیری سزا یہ ہے کہ تو اچھوت بن کر رہے۔ اس کے بعد (آخرت میں عذاب کا) ایک وعدہ ہے جو کبھی ٹلنے والا نہیں۔ اور دیکھ تیرے (گھڑے) ہوئے معبود کا اب کیا حال ہوتا ہے جس کی پوجا پر جما بیٹھا ہے۔ ہم اسے جلا کر راکھ کر دیں گے اور راکھ سمندر میں بہا دیں گے۔"

قصہ سامری اور تفاسیر

سورۂ طٰہٰ کی آیات ۹۶-۹۷ جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے ان کے بیان کے متعلق تفاسیر میں ہے کہ سامری نے جبرائیلؑ کو دیکھا اور ان کو پہچان لیا۔ وہ اسپ حیات پر سوار تھے۔ سامری کے دل میں یہ بات آئی کہ وہ جبرائیلؑ کے گھوڑے کے نشانِ قدم کی خاک اس بچھڑے میں ڈالے جس کو اُس نے بنایا تھا اور یہ فعل اس نے اپنے ہی ہوائے نفس سے کیا تھا۔ کوئی دوسرا اس کا باعث و محرک نہ تھا اس پر حضرت موسیٰؑ نے سامری سے کہا دور ہو جا۔ جب کوئی تجھ سے ملنا چاہے جو تیرے حال سے واقف نہ ہو تو اس سے بلکہ سب سے علیحدہ رہنا۔ نہ تجھ سے کوئی چھوئے نہ تو کسی سے چھوئے۔ لوگوں سے ملنا اس کے لئے کلی طور پر ممنوع قرار دیا گیا اور ملاقات۔ مکالمت، خرید و فروخت ہر ایک کے ساتھ حرام کر دی گئی اور اگر اتفاقاً کوئی اس سے چھو جاتا تو وہ اور چھونے والا دونوں شدید بخار میں مبتلا ہوتے۔ وہ جنگل میں یہی شور مچاتا پھرتا تھا کہ کوئی چھو نہ جانا اور وحشیوں اور درندوں میں زندگی کے دن نہایت تلخی اور وحشت میں گزارتا۔

تاریخی استقراء

یہ تھا بیان اس ظالمانہ تختِ اجلال کے ستونوں کا جو نظام خداوندی کے نفاذ کی راہ میں آہنی دیوار بن کر کھڑے تھے۔ ان کا سب جاہ و جلال عصائے کلیمی کی ایک ضرب سے پاش پاش ہو گیا لیکن ان لوگوں اور قوموں کا جو اس کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے انجام بھی اندوہناک ہوا۔ یہ سب اپنی تمام دولت، قوت اور لاؤ لشکر کے باوجود خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت سے نہ بچ سکے۔ اگر ثبوت چاہو تو اٹھو۔ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ ۲۷/۶۹۔ "روئے زمین پر پھرو اور دیکھو مجرمین کا کیا انجام ہوا۔" ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کی ٹھیکریوں پر تمہیں ان کی داستانِ حسرت لکھی ہوئی نظر آئے گی۔ اور یہ بستیاں عام شاہراہ پر واقع ہیں اور آمد و رفت کا سلسلہ اب تک قائم ہے (۱۵/۷۶-۷۹)

ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْقُرٰى نَقُصُّهُ عَلَيْكَ مِنْهَا قَائِمٌ وَّحَصِيدٌ (۱۱/۱۰۰)

"یہ پچھلی آبادیوں میں سے کچھ کا بیان ہے جو ہم سنا رہے ہیں ان میں سے کچھ تو اس وقت قائم ہیں۔ کچھ بالکل اجڑ چکی ہیں۔"

اس میں تاریخی استقرار اور حفارت (ARCHAEOLOGY) دونوں آگئے ہیں۔ یعنی اگر قومیں طبعی طور پہ زندہ ہیں تو ان کے احوال و کوائف اور اگر وہ باقی نہیں رہیں تو ان کے آثارِ قدیمہ۔ ان کے مطالعہ اور مشاہدہ کے لئے بار بار حکم دیا گیا ہے تاکہ اُن کی اثری شہادتوں سے مثبت اور تعمیری کردار کی سمت کا رخ متعین کیا جا سکے۔ ان تاریخی استقرار اور حفارت کا یہ مطلب نہ سمجھ لیا جائے کہ تباہ ہونے والی قومیں کوئی کمزور و ناتواں تھیں۔ یا ان کے پاس ذرائع نہیں تھے۔ قرآنِ حکیم بتاتا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں تھا بلکہ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ اَثَارُوا الْاَرْضَ (۳۰/۹) "وہ پوری طاقتور اور ساز و یراق مبارزت سے مالا مال تھیں اور زمین پہ ان کا پورا تصرف تھا۔ اور انہیں ایسا جما دیا تھا جیسا تمہیں بھی استحکام میسر نہیں اور یہ بھی نہیں تھا کہ وہ گنوار تھیں یا ان کی ذہنی سطح پست تھی"۔ بلکہ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْئِدَةً .... مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۴۶/۲۶) وہ سماعت و بصارت اور فواد سب کچھ رکھتے تھے لیکن چونکہ وہ قانونِ خداوندی کی موافقت سے انکار کرتے تھے اس لئے ان کی قوت، دولت، تعداد اور ذرائع علم یعنی سماعت، بصارت اور فواد ان کے کچھ کام نہ آسکے اور یہی ان کے زوال کا سبب ہے۔

ان تاریخی یادداشتوں کا تعلق صرف ماضی سے نہیں بلکہ ہر زمانے کے دیدۂ عبرت کے لئے ایک آئینہ کی حیثیت رکھتی ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کے اندر بقا صرف اُن لوگوں اور قوموں کو ہے۔ جو قانونِ الٰہی کا احترام کرتے ہیں اور اپنے نظامِ حیات کو قرآنِ حکیم کے بتائے ہوئے اصول و ہدایت اور قوانین و احکامات کی بنیادوں پہ استوار کرتے ہیں۔ یہی وہ نظام ہے جو باطل خداؤں کے لئے پیغامِ مرگ ہے یعنی فرعونیت، ہامانیت، قارونیت اور سامریت اور آج کی اصطلاح میں ملوکیت، یہی پیشوائیت، سرمایہ داریت اور سامریت!!! خدا ان باطل نظاموں سے محفوظ رکھے۔

پاکستان

پاکستان اسلام کے نام پہ حاصل کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں انتالیس سال گذرنے کو آئے ہیں لیکن اس خطۂ ارض میں وہ نظام قائم نہ ہو سکا جس مقصد کے لئے ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا۔ اس سے بڑھ کر اور ظلم کیا ہو سکتا ہے کہ جس مقصد کے لیے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ اس مقصد اور تصور کو کسی اور کی داستان سمجھ کر طاقِ نسیاں پر رکھ دیا گیا۔ ہماری اس کوتاہ بینی اور نظریۂ پاکستان سے اغماز برتنے کے نتیجہ میں پاکستان کا ایک اہم حصہ ہم سے جدا ہو گیا۔ اس بارے میں ۱۹۷۳ء میں پاکستان کا دورہ کرنے والے وفد کے قائد اور آنجہانی وزیرِ اعظم "اندرا گاندھی کے پرسنل سیکرٹری مسٹر ہکسر نے پاکستان سے واپسی پہ آل انڈیا ریڈیو کو ایک خصوصی انٹرویو دیتے ہوئے پاکستان کے متعلق کہا تھا۔

" اسلام پاکستان کی اساس تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد فوج، سول سروس اور مملکت کے دوسرے لوازمات کو مستحکم بنانے کی کوششیں کی گئیں لیکن بنیادی اساس اور اس رشتہ کو جو پاکستان کے مختلف علاقوں کو متحد رکھ سکتا تھا۔ نظر انداز کیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں " پاکستان کے ٹکڑے ہو گئے"

جسارت ۷ اگست ۱۹۷۳ء

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

آج بھی پاکستان کے موجودہ خلفشار کی کیفیت ماضی سے مختلف نہیں۔ نہ ماضی قریب سے اور نہ ماضی بعید سے!! پاکستان اس وقت ابلیسی قوتوں کی یلغار میں پوری طرح گھرا ہوا ہے۔ کیا ہم عصائے کلیمی اور تائیدِ خداوندی سے چوگرد ہتوں کو شکست نہیں دے سکتے یقین جانئے کہ اگر آپ نے اس کا عزم کر لیا تو تمام کائناتی قوتیں آپ کی اسی طرح پشت پناہی میں اکٹھی ہو جائیں گی جسطرح کبھی بدر میں ہوئی تھیں۔ شرط یہ ہے کہ گروہ بندیوں سے پاک ہو کر پھر سے ملتِ واحدہ بن کر اجتماعی طور پر اپنی تگ و تاز کا محور قانونِ الٰہی کو بنانا ہوگا۔ جو قرآن حکیم کی دفتین میں مکمل اور منزہ شکل میں موجود ہے۔

پاکستانی قوم آج جن مشکل حالات سے گزر رہی ہے وہ اسی قسم کے ہیں جو "رحمت اللعلمین" کی بعثت کے وقت تھے نزولِ قرآن کے زمانے میں انسانی معاشرہ کی جو حالت ہو چکی تھی اس کا نقشہ قرآن حکیم نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (۳۰/۴۱) "خشکی اور تری میں سب جگہ لوگوں کے اعمال کی وجہ سے، فساد ہی فساد برپا تھا" کوئی شعبہ اپنے صحیح مقام پر نہیں تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان خرابیوں کا الگ الگ علاج نہیں کیا۔ آپؐ نے ایک مملکت قائم کی اور اس میں قرآنی قانون نافذ کر دیا اور وہ تمام خرابیاں خود بخود دور ہو گئیں۔ بلکہ انسانیت نے کامرانیوں اور شادکامیوں کی ایسی پُر بہار زندگی دیکھی جس کی نظیر تاریخ عالم میں کہیں نہیں ملتی۔ رسول اللہؐ کی یہی سنت ہمارے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ مملکت میں قرآنی آئین کا قانون نافذ ہونے دو اور دیکھو کہ اس چمنِ خزاں دیدہ پر کسطرح بہاریں نچھاور ہوتی ہیں۔ یقین جانئے اگر پاکستان میں قرآنی آئین و قانون رائج ہو گیا تو اس کے درخشندہ و تابناک نتائج کو دیکھکر دنیا بھر کی قومیں اپنا نظام چھوڑ کر اس نظام کی طرف لے کر آئیں گی اور چشمِ فلک ایک بار پھر "يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا" کا حقیقت نگاہ نظارہ دیکھ لے گی اور اس حقیقت کا تماشا کر سکے گی کہ ؎

اٹھا جو مینا بدست ساقی، رہی نہ کچھ تابِ ضبط باقی
تمام مے کش پکار اُٹھے، یہاں سے پہلے، یہاں سے پہلے

دنیا کے مشکل ترین مسئلہ — تقدیر — کا قابلِ فہم اور بصیرت افروز حل

قرآن کریم کی روشنی میں
محترم پرویز صاحب کی کتاب
کتاب التقدیر

قیمت ۶۰/- روپے
(علاوہ محصول ڈاک)

طلوع اسلام کنونیشن ۱۹۸۷ء کا مقالہ

ملک میں پھیلی ہوئی لاقانونیت کا تجزیہ قرآن کریم کی روشنی میں

تاریخ انسانیت اس حقیقت پر گواہ ہے کہ جرم کا ارتکاب پہلے ہوا اور قانون بعد میں بنا، تاکہ آئندہ کے لئے جرم کا سدِّ باب کسی حد تک مداوا ہو سکے۔ وطن عزیز کی آنکھیں شرم سے جھک گئی ہیں کیونکہ ہم ایک ایسے جرم کا ارتکاب کر چکے ہیں جس کے لئے قانون تاحال نہیں بنا۔ ایسا جرم جو پوری تاریخ انسانیت میں نہیں ہوا۔ البتہ اس کی بے حرمتی کے خلاف قانون موجود ہے۔ لیکن اس جرم کے خلاف واضح قانون اس لئے موجود نہیں کہ اس جرم کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اب اس کے لئے قانون ناگزیر ہو گیا ہے اور وہ جرم ہوا ایک مردہ نوجوان خاتون کے ساتھ زیادتی کا۔ یہ ہے لاقانونیت کی انتہا۔ اب ذرا ابتدا سے بات شروع کرتے ہیں۔

بظاہر یہ دو[illegible]ن، ہم قافیہ اور ہم ردیف الفاظ کسی باقدرے کے ہاتھ سے نکلے ہوئے کم تب ہی نظر آتے ہیں لیکن اگر ان کو بغور مطالعہ کرنے کے بعد دیکھا جائے تو اپنے اندر الفاظ و معانی کے علاوہ ایک ایسی حقیقت کا سمندر بے کراں لئے ہوئے ہیں جس سے آج پوری انسانیت کا تن ڈھانپا ہوا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بظاہر تن ڈھانپا ہوا ہو لیکن دراصل وہ ننگا ہو۔ جلوت میں بھیڑ بنا ہو لیکن خلوت میں بھیڑیا ہو۔ تو پھر بتا دینا چاہتا ہوں وہ الفاظ ہیں تانا اور بانا۔

یہی تانا اور بانا اگر بگڑ جائے۔ تانا کسی بانے میں الجھ جائے اور نہ کھلے تو ذرا تصور میں وہ وقت لائیں جب پوری انسانیت اس وقت تک ننگی کھڑی رہے گی جب تک تانے کے ساتھ بانا بغلگیر ہو کر لباس کی شکل اختیار نہ کر لے لہٰذا اس سے قبل کہ میں ملک میں پھیلی ہوئی لاقانونیت پر کوئی بات کروں مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ہمارے ملک کا تانا اور بانا بگڑ چکا ہے۔ کوئی اگر یہ کہے کہ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں محنت سے کام لیا جائے تو میں صاف الفاظ میں یہ کہنے کی جرات کرتا ہوں کہ امید کے بھی کوئی آثار نہیں۔ ہر قدم کے اٹھانے پر منزل دو قدم پیچھے کو سرکتی ہے۔ بادی النظر میں تو دی گئی مثال چھوٹی سی نظر آتی ہے لیکن اپنی گہرائی کے لحاظ سے وزن دار ہے۔

آپ کسی بھی اونچی عمارت پر کھڑے ہو کر اپنے ملک کے کسی بھی شہر کو دن کے وقت صرف پندرہ منٹ کے لئے قومی نقاد کی حیثیت سے حقیقت پسندی کا چشمہ لگا کر دیکھیں تو بلا تامل آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ کوئی بھی خصوصیت خوبی۔ یکسانیت۔ وقار۔ جو کسی قوم کا تقاضا ہوتا ہے آپ کو نظر نہیں آئیں گے۔ بس ایک متحرک ہجوم بہتا ہوا دیکھیں گے۔ اس میں محسوس کرنے کی بات نہیں اور نہ ہی کسی خدانہ کردہ قومی تذلیل کی بات کر رہا ہوں۔ بلکہ وہ سب لوگ جو دل میں قومی درد رکھتے ہیں یہ حالت دیکھ کر کڑھنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔

جسے دیکھیں اپنی مٹھی میں انفرادیت کی غرض لئے ہوئے نظر آئے گا۔ قومی سطح پر سوچ کا تصور ہی ختم ہو چکا ہے۔ اس سے بڑی اور کیا لاقانونیت ہو سکتی ہے کہ جسے دیکھیں اپنی بات کی ابتدا وطن عزیز کو فیشن کے طور پر گالی دے کر کرے گا۔

یہاں سب سے سستی چیز آپ کو ملے گی الفاظ کی دنیا میں تو مہنگی ہے لیکن مادی شکل میں بہت سستی ہے۔ وہ ہے انسانی خون۔ جس کے متعلق قرآن کریم کے الفاظ ہیں۔

وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ط ۵/۳۲

جس نے ایک زندگی بچائی گویا اس نے پوری انسانیت بچائی۔ غرض جس نے ایک زندگی ضائع کی پوری انسانیت کی ہلاکت کا باعث بنا۔

وطن عزیز ایک لمبی جدوجہد کے بعد آزاد ہوا۔ آزادی کے فوراً بعد کسی ملک کو جو مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ ہم بھی روایتی طور پر ان مسائل کا شکار ہوئے۔ وہ لوگ جو آزادی کے مخالفین میں اپنے آپ کو ہراول دستے میں شمار کرتے تھے وہی لوگ آزادی کے داعی بن بیٹھے اور اس طرح تعمیر کی بجائے تخریب کی پہلی اینٹ چن دی گئی۔ حمایت اور مخالفت کرنے والے حضرات میں آج بمشکل ۳ سے ۵ فیصد تک زندہ ہیں اور وہ بچہ جو ۱۴ اگست کو پیدا ہوا آج چالیس سال کا پختہ عمر پاکستانی ہے۔ اس نے صرف تعلیم حاصل کی DIPLOMA DISEASE کا مریض ہوا اور بچوں کا کفیل ہوا۔ قومی تعمیر کی تربیت سے ناآشنا یہی روایت چل پڑی۔ دوسری اور تیسری نسل اس وقت DIPLOMA DISEASE کے دور سے گزر رہی ہے اور اب ہماری حیثیت بالکل ایسی ہے جس کا نقشہ قرآن نے ان الفاظ میں کھینچا۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ ۝ ۴۷/۱۲

اس تصور حیات کے حامل انسانوں کی طرح کھاتے پیتے اور دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ صرف ایک فرق رکھ دیا کہ مرنے کے بعد حیوان نہ کہلائیں تو نماز جنازہ ادا کر دی گئی۔

جن لوگوں نے منزل کا تعین کیا تھا ان کو ایسی مشکلات میں پھنسا دیا گیا کہ وہ آزادی حاصل کرنے میں تو کامیاب

ہوگئے لیکن منزل تک پہنچنے میں یقیناً ناکام ہوگئے۔ چنانچہ کسی ملک میں عوام اور رعایا کے درمیان حقوق و فرائض بس ایک مقدس امانت لیکن شجر ممنوعہ بن کر رہ گئے۔ بچوں کو امتحان میں کامیابی کی حد تک پڑھائے جاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک حقوق و فرائض کے عملی شکل کا تعلق ہے تو بس یہاں حاکم کو اپنے فرائض کا علم نہیں تو محکوم کو حقوق کا پتہ نہیں۔ اور اسی طرح حاکم کو اگر حقوق کا نہیں تو محکوم فرائض سے ناآشنا۔ پورا ملک پولیس سٹیٹ بن کر رہ گیا ہے۔ ایک چھوٹا سا حوالہ دیے بغیر بات ادھوری سمجھوں گا۔ اس حوالہ کا اختصار کچھ یوں ہے کہ ایک شخص کے خلاف مقدمہ رجسٹرڈ ہوا تو علاقہ تھانہ دار نے اس کے باپ کو پکڑ کر حبس بے جا میں رکھا۔ معاملہ عدالت میں پیش ہوا اور عدالت اس نتیجہ پر پہنچی کہ تھانہ دار صاحب نے ایسا کیا ہے۔ عدالت کے تاثرات حسب ذیل ہیں۔

The perusal of the police file reveals, that a fake andahalf-hearted attempt was made to implicate Malik Shammun falsely in this case.It is regrettable to note the conduct and the manner of investigation, being carried out by the police department. Such matters are now being experienced by this court as a matter of routine and as common features, in which the investigator sadistic-ally tortures the kith and kins of the persons wanted by them.I am, thus constrained to observe, that the police department is being reduced into an apparatus of torture, which is adding to the miseries of the people. In a civilised society being run on the principle enunciated by Islam, the organisation of Police has also to serve as a welfare agency, which should be out to come to the rescue of the downtrodden people.

I am at pains to know as to when the authorities would take stock of things after awakening from their slumber,so that once for all the archaic mode of investigation is done away with in which for securing the attendance of the persons wanted by the police their relations are humiliated and tortured by the police.

It is high time for the police department to know that the society is changing swiftl y, the equilibrium of the values is also undergoing through a rapid change,if the police department does not keep pace with time it will not be able to detect and check the crime

in the society. Main emphasis in this behalf is to be placed upon the restraint to be exercised upon the use of "Raw Power" and re-orientation with regards to its use,otherwise the balance cannot be stuck in the society.

Cr: L. Journal Page 229

اب اگر آپ غور فرمائیں تو حقوق و فرائض صرف تعلیم کی حد تک کتابوں میں محفوظ ہو کر رہ گئے ہیں۔ جتنی بھی حکومتیں آج تک آئیں یا لائی گئیں صرف حکومت کرنے تک محدود رہیں۔ اپنے "آج" تک محدود رہیں۔ ان کی نظر میں "کل" کا کوئی تصور نہ رہا۔ کوئی بھی قوم (خیر سے اب تو چار قومیتوں کی بات ہو رہی ہے) اس وقت تک ترقی کے منازل طے نہیں کر سکتی جب تک ان کی نظر میں کل نہ ہو۔ حکومت ہو یا عوام، دونوں اپنے طور پر "آج نقد اور کل ادھار" کا اصول اپنائے ہوئے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے ایک ایسی لاقانونیت کی شکل میں سامنے آ رہا ہے جس کی ہمیں توقع ہو گی۔

قانون انسان کا بنایا ہوا ہو یا وحی کے ذریعہ انسان کو ملا ہو۔ دونوں کا اطلاق انسان پر ہو گا۔ اور اس میں کسی بھی طور اپنے منصب یا دنیاوی جاہ و چشم کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ یہاں میں قانون کی بالادستی کے سلسلے میں ایک اقتباس جناب پرویزؒ کی کتاب "نظام ربوبیت" سے پیش کرتا ہوں۔

"یہ درست ہے کہ خدا بڑی قدرتوں کا مالک ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ اس کے ارادے اور فیصلے کے سامنے رکاوٹ بن کر کھڑا ہو جائے لیکن اس خدا نے خود ہی بتا دیا ہے کہ ہماری اس قدرت اور قوت کا ظہور یونہی ہنگامی طور پر (جس کا آج ہم شکار ہیں) نہیں ہوتا بلکہ ایک قاعدے اور ضابطے کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی کو ہم نے قانون خداوندی سے تعبیر کیا ہے لہٰذا یہ انقلاب قانون خداوندی کی قوت سے ظہور میں آئے گا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم بہت کم سمجھتے ہیں کہ قانون میں کتنی بڑی قوت ہے۔ اول تو جب ہم قانون کا لفظ بولتے ہیں تو ہماری نگاہ عدالتوں کی طرف اٹھ جاتی ہے کیونکہ ہم نے قانون کا لفظ عدالتوں ہی کے ضمن میں سنا ہے۔ لیکن قانون عدالتوں تک محدود نہیں یہ ساری کائنات کو محیط ہے۔"

اس اقتباس کو سامنے رکھ کر نظر دوڑائیے۔ ہم نے مختلف نظریات کی تشریح کے لئے مخصوص اندازِ فکر اپنا لیا ہے۔ مثلاً جب یہ کہا جائے کہ ملک میں نظامِ شریعت (حالانکہ جس نظامِ شریعت کا چرچا کیا جا رہا ہے اس کا نفاذ اتنا ہی ناممکن ہے جتنا ناممکن لفظ اپنے اندر ناممکنات کا ایک سمندر لئے ہوئے ہے) نافذ کیا جائے تو ذہن فوری طور پر چند سزاؤں کی طرف چلا جاتا ہے۔ نظامِ شریعت کے رحیمانہ اور کریمانہ خصوصیات

خصوصیات کی طرف ہرگز نہیں جاتا۔ مضمون ہذا کو شروع کرنے سے صرف پانچ منٹ قبل میں نے یہ خبر سنی کہ آپ ہی کے شہر لاہور میں ایک مذہبی جماعت کے اجتماع میں بم کا دھماکہ ہوا اور اس میں پانچ افراد ہلاک ہو گئے۔
"ہائے زندگی کہ ہم سے تو کیوں روٹھ گئی ہے اس دن کے لئے حاصل کی گئی تھی"
لاقانونیت کا لفظ کتنا بھیانک ہے اس کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ چند دن قبل ہمارے ہی ملک کا ایک بہت بڑے شہر جو آبادی کے لحاظ سے ملک کا سب سے بڑا شہر ہے۔ پورے چھ گھنٹے تک کشت و خون کی لپیٹ میں تھا۔ جس کی مثال آج بھی تاریخ دینے سے قاصر ہے۔ آزادی کے چالیس سال گذرنے کے بعد بھی۔ ایک قوم۔ ایک وطن۔ ایک خدا۔ ایک رسول اور ایک کتاب کا نعرہ لگانے والے زندہ بچوں کو آگ کے شعلوں میں دھکیلنے کے بعد اس کے سامنے رقص کرتے ہیں اور انتظامیہ خاموش تماشائی بنی بیٹھی رہی۔
سال کے ۳۶۵ تعلیمی ایام میں ملک بھر کے کالج اور یونیورسٹیاں ۳۰۰ دن بند رہتی ہیں۔ طلباء کی جیبوں سے قلم کی بجائے ریوالور برآمد ہو رہے ہیں۔ طلباء کو سینکڑوں گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے سب گروہ ایک دوسرے کے جانی دشمن بن چکے ہیں۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے بند ہونے کے اگلے ہی روز اخبارات میں بیانات آنا شروع ہو جاتے ہیں کہ فوراً کھولے جائیں، ورنہ ذمہ داری انتظامیہ پر ہوگی۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کو اسلحہ خانوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ تعلیم کا ماحول دور دور تک نظر نہیں آتا۔ سیاسی جماعتوں نے خوب خوب گل کھلائے ہیں۔ طلباء سے ناجائز سیاسی فوائد حاصل کئے جا رہے ہیں۔ طلباء مزدور۔ کسان۔ سرکاری ملازم کوئی بھی اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہی نہیں رہا ایک ہُو اور ہا کا عالم ہے۔
قومی تربیت نام کی کوئی شے باقی ہی نہیں رہی۔ کسی منزل کا تعین کئے بغیر ہر ایک بھاگتا جا رہا ہے۔
اب اٹھائیے ذرا اپنی چالیس سالہ تاریخ اور تجزیہ کیجئے۔ کوئی ایسا دن بتائیے جس دن ملک میں لاقانونیت کا نفاذ حقوق و فرائض کو سمجھنے والوں کی طرف سے نہ ہوا ہو۔ یہ سب کچھ صرف ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے ہوتا ہے۔ ہم نے آج تک سنجیدگی سے نہیں سوچا کہ وہ کون سے محرکات ہیں جو لاقانونیت میں ممد و معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ بس کسی ایک حادثہ کو سیاسی شوشہ بنا دیا جاتا ہے اور پھر ہر سیاستدان بغیر کسی نتیجہ کو ذہن میں رکھے بیانات داغتا چلا جاتا ہے۔ ذاتی دشمنی کی بنا پر انفرادی قتل کو سامراجیوں اور امریکہ نوازوں وغیرہ کے نعروں میں تبدیل کر دیا جاتا ہے جہالت کا نام جذبۂ ایمانی رکھ دیا گیا ہے۔
اکھ وڑکی آبادی کا ملک اس وقت اپنی ٹولیوں کے اعتبار سے تقریباً ۵۰ لاکھ ٹولیوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ بھانت بھانت کی بولیاں ہیں۔ کہیں سے سوشلزم کی پکار ہے۔ تو کہیں سے نظامِ شریعت کی اذان۔ اب تو اسلامی نظام بھول گئے ہیں بلکہ نظامِ مصطفےٰ کے نام پر ایک حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا تھا کیونکہ نفاذِ شریعت

نے جگہ لے لی ہے۔ کوئی فقہ حنفیہ کی تسبیح جاپ رہا ہے تو کوئی فقہ جعفریہ کا ورد کر رہا ہے۔ کہیں سے پٹھان قومیت کی گرج سنائی دے رہی ہے تو کوئی سرائیکی نغمہ الاپ رہا ہے۔ غرض ہر رنگ میں لاقانونیت کا بھرپور اظہار کرنے پر کیا سیاسی رہنما اور کیا مذہبی پیشوا، کیا علماء اور کیا اولیاء سب ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ ہر طرف ایک شاہ گردی ہے۔ آئیے اس کا عکس آئینہ قرآن میں دیکھیں۔ ہمارا ہونا اتنی بڑی بات نہیں جتنا ہماری سمت کا تعین ہے۔

قرآن کے جملہ قوانین جیسے کائنات میں خارجی طور پر عمل پیرا ہیں۔ اسی طرح قرآنی قوانین کا اطلاق ہماری دنیاوی اور معاشرتی زندگی پر بھی ہے۔ قرآن مجید میں صرف اور صرف دو گروہوں کا ذکر ہے۔ کسی تیسرے گروہ کا اگر ذکر آیا ہے تو وہ گروہ ہے جو اپنا تعلق دونوں سے ظاہر کرتا ہے۔ ایک گروہ مومنین کا ہے جبکہ دوسرا گروہ کفار کا ہے۔ جیسے میں عرض کر چکا ہوں کہ قانون کا نام لیتے ہی عدالت ذہن میں آتی ہے جو دراصل غلط تعلیمات کا نتیجہ ہے اسی طرح 'کافر' کا نام لیتے ہیں تو ذہن میں یہود و ہنود و انصاری آجاتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن کبھی نہ کہتا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا...... ۴/۱۳۶

اے وہ گروہ جو اپنے آپ کو مومن کہلاتے ہو ایسا ایمان لاؤ جیسا کہ ایمان کا تقاضا ہے۔

بہ الفاظ دیگر قرآن کہتا ہے کہ عام لوگوں کی حالت یہ ہے کہ اس حد تک وہ مانتے ہیں کہ کائنات میں ایک خارجی قانون جاری و ساری ہے لیکن جب وہ انسانوں کی دنیا میں آتے ہیں تو اس سے انکاری ہو جاتے ہیں۔ چاند، سورج، ستارے، سیارے اور خود ہماری زمین ایک ضابطہ کے تحت محوِ عمل ہے۔

وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ۲۹/۶۱ اے رسول! اگر تو ان سے یہ پوچھے کہ کائنات کے یہ اونچ نیچ کیسے عمل میں آئی اور وہ کون سا ایسا قانون ہے جس نے چاند اور سورج کو مسخر کر رکھا ہے تو بغیر چون و چرا جواب دیں گے کہ اللہ نے ایسا کیا ہے۔ اب اگر کائنات میں اتنی محیر العقول چیزوں کو اس کا قانون محوِ عمل رکھتا ہے تو پھر ایسی کون سی بات ہے جس سے انسان اپنے آپ کو زیر قانون نہ پائے۔ اسی فرق کو خداوند لم یزل نے واضح کر دیا ہے یعنی وہ لوگ جو اول الذکر قانون پر تو یقین رکھتے ہیں لیکن موخر الذکر پر یقین نہیں رکھتے یعنی دنیاوی زندگی میں اس کا اطلاق غیر ضروری یا ناممکن سمجھتے ہیں۔ قرآن ان کو "کافر" کہہ کر پکارتا ہے اور جو انسان کے خود ساختہ قانون کو انسانی زندگی میں نافذ العمل کئے ہوئے ہیں۔ قرآن ان کو مشرک کہہ کر پکارتا ہے۔

بَلِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِیۡ تَکۡذِیۡبٍ ۙ﴿﴾ وَّ اللّٰہُ مِنۡ وَّرَآئِہِمۡ مُّحِیۡطٌ ۸۵/۲۰-۱۹
یہ لوگ جو ہمارے قانون سے انکار کرتے ہیں خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے اس قانون کو غلط ثابت کر دیا لیکن ہمارا قانون انہیں اس کے باوجود چاروں طرف سے گھیرے ہوتا ہے۔

یہی اصول اگر اپنا لیا جائے تو نتائج خود بخود نظر آئیں گے لیکن یہاں دکھ اس بات کا ہے کہ پوری قوم صرف اس اقرار تک متفق ہے کہ یہ کتاب الٰہی ہے۔ جہاں تک اس کتاب الٰہی کے مندرجات کا تعلق ہے تو پوری قوم کو یہ لوری دے کر سلا دیا گیا ہے کہ یہ کتاب انسان کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ صرف اس کو بوسہ دینا ثواب ہے۔ اور عمل اس پر کون کر سکتا ہے۔

وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۱/۱۳

وہ لوگ جو نظام خداوندی یا قرآنی نظام کے علمبردار ہوں گے ان کے فرائض میں کیا ہوتا ہے۔

اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ ۴۱/۲۲

اس نظام کے حاملین کو جب تمکن فی الارض حاصل ہوتا ہے تو یہ ایک ایسے نظام کی داغ بیل ڈالتے ہیں جس میں بنی نوع انسان کی نشو ونما کے علاوہ نظام صلوٰۃ بھی ہوتا ہے۔ یہاں حالت یہ ہو گئی ہے کہ پوری قوم اپنی لاقانونیت کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے حزبوں میں بٹ گئی ہے اور

کُلُّ حِزۡبٍۭ بِمَا لَدَیۡہِمۡ فَرِحُوۡنَ ۳۲/۳۰

ہر ایک پارٹی۔ سیاسی جماعت ہو یا مذہبی فرقہ سب کے سب اپنے اپنے مسلک میں خوش ہیں۔ اتنے بڑے شور و غل میں۔ ایک کونے سے "صرف قرآن کو کافی سمجھو" کی آواز بھی ہلکی ہلکی سنائی دے رہی ہے۔

وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ ۱۷/۱۳

عبداللہ ثانی
ایڈووکیٹ۔ پشاور

عقل خود بیں غافل از بہبود غیر	سود خود بیند، نہ بیند سود غیر
وحی حق بینندۂ سود ہمہ	در نگاہش سود و بہبود ہمہ

ثریّا عندلیب

دین و دنیا لازم و ملزوم ہیں

دین و دنیا کے الفاظ ہماری زبان سے نکلتے ہی رہتے ہیں۔ ہماری روزمرہ گھریلو اور معاشرتی زندگی میں اِن الفاظ کے استعمال کی ضرورت بہر طور رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ہم کوئی جملہ بولتے ہیں تو ہمارے سامنے ہر لفظ کا ایک متعیّن مفہوم ہوتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے ہاں دین اور دنیا کا مفہوم کیا لیا جاتا ہے اور ان دو اہم لفظوں کے حوالے سے ہمارے درمیان کیا عقیدہ یا تصوّر مروّج ہے۔ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ ہماری دنیا تو ہمارے روزمرّہ کے اُن کاموں سے تعلق رکھتی ہے جو ہم اپنی زندگی کے مختلف شعبوں میں انجام دیتے ہیں اور خود کو زندہ رکھنے کے لیے روزی کماتے ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں۔ اس خطّہ ارضی پر گھومتے پھرتے ہیں اپنی خواہشات کو پورا کرتے ہیں۔ بیاہ شادیاں کرتے ہیں۔ رسم و رواج کے مطابق معاملات کو نبھاتے ہیں۔ تعلیم حاصل کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ یعنی اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ زمین پر ہم جو زندگی بسر کرتے ہیں وہ ہماری دنیا ہے۔ اس میں شک بھی کوئی نہیں کہ دنیا ہماری اس حیاتِ ارضی ہی کا دوسرا نام ہے۔ یہ تو ہوئی دنیا لیکن دین کیا ہے؟ دین ایک مکمل نظامِ زندگی ہے جو اللہ کی آخری کتابِ مبین عطا کرتی ہے جو قرآن کریم ہے۔ جسکی تا قیامت حفاظت کا ذمّہ خود خدائے رحیم نے لیا ہے اور جسے مکمل و غیر متبدّل بنایا ہے۔ تمام دنیا کے لیئے عالمگیر انسانیّت کے لیے مگر ملوکیّت کے سحر زدہ انسانوں نے کیا یہ کہ دین کو مذہب کا نام دے کر اور اسے اللہ کی بندگی اور پرستش سے تعبیر کر کے دین کو اپنے نظامِ زندگی اور کاروبارِ دنیا سے بالکل الگ کر دیا۔ یعنی دین تو ہو گئی اللہ کی چیز اور دنیا پر قبضہ ٹھہرا انسانوں کا۔ اب جو جی میں آئے کرو۔ اس طرح ہم نے دین اور دنیا کو الگ الگ خانوں میں بانٹ کر اپنے پیش پا افتادہ مفادات کی تکمیل کے لئے بزعمِ خویش راستہ صاف کر لیا۔ ایک طرف یہ ہمارا بڑا مستحکم معیارِ زندگی ہے۔ دوسری طرف ہمیں اس کا بھی بلند بانگ دعویٰ ہے کہ ہم قرآن پر پکا ایمان رکھتے ہیں۔ اور کہنے کے لیے ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن ہمارا ضابطۂ حیات ہے۔ بلا شک و شبہ قرآن حکیم ضابطۂ حیاتِ انسانی ہے۔ لیکن ہم مذہب زدہ مسلمان اگر سچ مچ درحقیقت اس کلام اللہ کو اپنی حیات کا ضابطہ سمجھ لیتے تو پھر ہماری دنیا اور ہمارے دین میں یہ تفریق نہ ہوتی جو ہم نے ڈال رکھی ہے اس لئے کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے

اپنے بندوں کے لئے دین و دنیا کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ دین انسان کو دنیا میں رہنا سکھاتا ہے۔ چنانچہ دنیا کا ہر کام جو وحی خداوندی کی روشنی میں سرانجام دیا جائے، دین بن جاتا ہے۔ یوں دین نام ہے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں مستقل اقدارِ خداوندی یعنی قرآن کے مطابق نوعِ انسان کی بہبود کے لیے صَرف کرنے کا۔ اس کے لئے اجتماعی زندگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ جو اجتماعی نظامِ حیات وحی کی مقرر کردہ حدود کے اندر مُتشکل ہو، اسے دین کہیں گے یہی دینِ اسلام ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا دین بارگاہِ خداوندی میں قابلِ قبول نہیں۔ دین اسلام کا اجتماعی نظام انسانی زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہے۔ قرآن میں اسی نظام کے بنیادی اجزائے ترکیبی موجود ہیں۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا ۳/۱۰۲ اس کی بنیادی سند ہے۔ وہ اعتصام بحبل اللہ کو اجتماعی قرار دیتا ہے، انفرادی نہیں۔ اسے جماعتی نظم و نسق کہتے ہیں جب دین کو مذہب کا لبادہ پہنا دیا گیا تو وہ انفرادی ہو گیا، اجتماعیت ختم ہو گئی۔ انفرادی ہو جانے سے ہر فرد اپنی نجات اور اپنے مفاد کے پیچھے لگ گیا۔ اور اس کے لئے کارآمد طریقہ یہی تھا کہ دین کو مذہب کا نام دے کر اسے خدا کے ساتھ بس اپنا پرائیویٹ تعلق قرار دے دیا جائے۔ تاکہ وہ ہماری دنیا پر اثر انداز نہ ہونے پائے اور یوں ہم دنیا میں رہتے ہوئے مستقل اقدارِ خداوندی کی پابندیوں سے نجات حاصل کر کے نہایت اطمینان و آرام کے ساتھ من مانیاں کرتے چلے جائیں۔ سب کچھ ہمارے اپنے اور اپنی آل اولاد کے اس دنیاوی زندگی کے فائدوں شادمانیوں اور کامیابیوں کے لیے ہو۔ وہ کامیابیاں اور وہ فائدے جن سے ہم معاشرے میں 'معزز و محترم' کہلا سکیں۔ دوسروں کو اپنے سامنے جھکا سکیں۔ مال و اسباب سے اپنے گھر بھر سکیں۔ زمینوں کے مالک بن سکیں۔ جو چاہیں کر سکیں۔ اور کسی کو ہمارے سامنے چوں کرنے کی مجال نہ ہو۔ اس کے علاوہ ہمارے مذہبی پرہیزگار ہونے پر بھی کوئی حرف نہ رکھ سکے۔ اس لیے کہ نماز روزہ زکواۃ حج سارے ارکان سارے مناسک تو ہم ساتھ کے ساتھ پورے کرتے چلے جائیں گے۔ انہیں ادا ہی تو کرنا ہے اس میں ہمارا کیا بگڑتا ہے۔ زکواۃ کے اڑھائی فی صد دے دینے سے ہمارے پاس کوئی کمی نہیں ہو جائے گی بلکہ ثواب سے ہماری جھولیاں بھر جائیں گی اور خیراتیں دینے سے تو ویسے ہی ہمارا ہاتھ اونچا رہتا ہے

دوسرے معاشرتی معاملات بھی ہماری ذاتی سوچ اور اپنی فکر کے مطابق طے پاتے چلے جائیں گے۔ دیکھنا تو صرف یہ ہے کہ ہمارا کسی قسم کا دنیاوی نقصان نہ ہو جائے۔ دوسروں پر جو بیتتی ہے بیتے۔ اس کے ہم ذمہ دار نہیں۔ ہم دین کو کیا کریں وہ تو ہمارے ذاتی خیالات اور دنیاوی معاملات میں گھسے جا رہا ہے اس نے تو اپنی بنیاد ہی یہ بتائی ہے کہ انسانوں کے معاملات دوسرے انسانوں کے ساتھ کیسے ہونے چاہئیں۔ دین تو یہ کہہ رہا ہے کہ کسی انسان کو یہ حق نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا محکوم اور محتاج بنا لے۔ دین نے تو ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کر دی ہیں۔ گویا اس دنیا میں رہتے ہوتے ہمیں ہر قدم اٹھانے کے لیے دین

کا سہارا لینا ہوگا! بھلا یوں زندگی کیسے گزرے گی۔ کیسے ہمارے حساب سے پھلے پھولے گی۔ نہ بابا! ہمیں ہماری دنیا میں ہی رہنے دو۔

حضرت شعیبؑ سے ان کی قوم نے یہی تو کہا تھا کہ یہ آپ کی صلوٰۃ (دین) کیسی ہے جو ہماری روزمرہ معمولات میں دخیل ہوئے جا رہی ہے۔ ہماری مرضی چلنے نہیں دے رہی۔ نہ ہم جس طرح جی چاہے دولت حاصل کریں۔ اور نہ ہی جس طرح جی چاہے اسے خرچ کریں۔ ہمارا مذہب تو ہم پر ایسی کوئی پابندی نہیں لگاتا۔ مذہب کا یہی سہل راستہ ہم بھی اختیار کرنا چاہتے ہیں اور کئے ہوئے ہیں۔ یہ ہم انسانوں کا وضع کردہ راستہ (مذہب) ہی تو ہمارے لئے من آسانیاں پیدا کرتا ہے۔ حق و ناحق کی اخلاقی دیواریں ہمارے سامنے کھڑی نہیں کرتا۔ ہمیں حرام و حلال کے چکر میں نہیں ڈالتا۔ جائز و ناجائز کو ہماری عقل خود بیں کے حوالے کر دیتا ہے۔ وہ صرف اتنا ہی تو کہتا ہے۔ کہ اللہ کی پرستش کرو۔ ہر وقت اللہ کا نام پکارتے رہو۔ رسولؐ پر درود بھیجتے رہو تمہیں بے حد و حساب ثواب ملے گا۔ تمہاری ساری مرادیں بر آئیں گی۔ اس کے بعد ہمیں اور کیا چاہیے؟ ۔ یہ سب کچھ ہم موجود زندہ افراد کے عقائد و اعمال ہیں۔ اس پر بھی ہمیں اسلام کے نام لیوا یعنی مسلمان کہلائے جانے پر اصرار ہے۔ کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ ہمارا مذہب اسلام ہے۔ مشکل یہی تو ہے کہ ہم اپنے مذہب اپنے خود ساختہ راستے کو اسلام کہہ رہے ہیں۔ جبکہ اسلام سرے سے مذہب ہے ہی نہیں وہ تو دین ہے جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پسند کیا ہے وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا... (۵/۳) اور یہ کہ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (۳/۱۸) بے شک اللہ کے نزدیک اسلام ہی دین ہے اس کے لیے مذہب کا لفظ تک قرآن کریم میں نہیں آیا۔ یہی الدِّيْن ہے جسے دے کر نبی اکرمؐ کو بھیجا گیا (۹/۳۳) اور خدا وہ ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اس دین (نظامِ حیات) کو دیگر تمام ادیان (نظام ہائے حیات) پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ چیز کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے (۶۱/۹)۔ قرآن تو یہ بتا رہا ہے کہ اگر ہم بندوں نے اس دین کو اختیار نہ کیا یعنی اسے اپنا نظام حیات بنانے سے انکار کیا، یہ ہمیں ناگوار ہوا تو ہمارا شمار مشرکوں میں ہوگا۔ اپنی دانست میں خود کو مسلمان گردانتے ہوئے ہم قرآن کی آیات کی تلاوت تو کر لیتے ہیں یعنی اس کے الفاظ تو دُہرا لیتے ہیں لیکن ہمیں ان کے قرآنی مفہوم سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا اس لئے کہ ایسا کرنے سے ہمارے مذہب کے تحت ہونے والے دنیاوی کاروبار قائم نہیں رہ سکتے۔ اس دین خداوندی کا مقصود تو یہ ہے کہ دنیا کے انسان اس انداز سے مل جُل کر رہیں کہ ہر فرد انسانی کو اپنی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو اُبھارنے اور نشوونما دینے کے یکساں طور پر اسباب و مواقع ملتے رہیں۔ یہ وہ نظام ہے جس میں ہر فرد دوسرے فرد کی ربوبیت (انسانی صلاحیتوں کی نشوونما) کا ذریعہ بنتا ہے اور اس طرزِ عمل سے خود اس کی انسانیت کو بھی سامان ربوبیت ملتا ہے۔ اس دنیا میں رہتے ہوئے دین ہمارے لئے وہ عملی ضابطہ زندگی ہے جس کے مطابق معاشرہ

متشکل کرنے سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو گا جب ہم دل کے پورے اطمینان کے ساتھ، بہ طیبِ خاطر، دین کا تجویز کردہ راستہ اختیار کریں گے اور ان تمام قوانین وضوابط کو لازمی طور پر اختیار کریں گے جنہیں انسانی ذات کی نشوونما اور اس معاشرہ کے نظم وضبط کے لئے قرآن نے متعین کیا ہے۔ اسی نصب العینِ حیات کو سامنے رکھنے والے بالفاظ دیگر دینِ اسلام پر ایمان لانے والے، دین اور دنیا کو جدا جدا نہیں رکھ سکتے اللہ تعالیٰ نے دین اور دنیا کو ایک دوسرے کے لئے بنایا ہے۔ یہ دنیا پیدا ہی اسی لئے کی گئی ہے کہ اس میں اللہ کی عطا کردہ مستقل اقدار کی بنیادوں پر دین کی عمارت کو استوار کیا جائے۔ دین کی یہی عمارت مسلمان کی پہچان بنتی ہے۔

دین کو اختیار کرنا لاریب پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنے کا نام ہے۔ قدم قدم جانا ہوتا ہے مگر ہر قدم آگے بڑھتا ہے ہم نے مسلمان ہونے کو یوں آسان سمجھ لیا یا بنا لیا کہ مذہب کو اپنا لیا جس میں ہر قدم آگے بڑھانا جائز ہی نہیں ہمارے مذہب کا یہ دعویٰ ہے کہ صدیوں پہلے جو کچھ ہم جیسے انسانوں نے سوچا تھا اس سے ایک قدم ادھر اُدھر ہٹنا جہنم میں گرنا ہے۔ اس لئے ہمارے قدم جامد ہو چکے ہیں۔

دین ہماری فکری صلاحیتوں کو ابھارتا ہے۔ وہ زندگی کی مستقل اقدار کو سامنے لاکر انسانی فکر کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنے دنیاوی حالات اور زمانے کے تقاضوں کے پیشِ نظر ان مستقل اقدار (جو قرآن میں موجود ہیں) کی روشنی میں اپنے لئے جزئیاتِ قانون مرتب کرے۔ یوں ارتقائی منازل طے ہوتی چلی جائیں۔ مگر یہ نہیں ہوتا اس لئے کہ مذہب نے عقل وفکر سے کام لینا حرام قرار دے رکھا ہے۔ مگر ہم ہزار خود فریبی میں خود کو مبتلا رکھیں ہمارا مذہب خدا کے دین کو شکست نہیں دے سکتا۔ یہ دین اسی دنیا میں انسانی معاشرہ میں قائم ہوا تھا۔ جب انسانوں نے اس سے مُنہ موڑ لیا تو یہ اپنی کائناتی رفتار سے آگے بڑھتا رہا اور بڑھ رہا ہے۔ اس نے اپنا پروگرام تکمیل کو پہنچانا ہے۔ انسانیت نے اسی دینِ خداوندی سے ارتفاع وارتقاء حاصل کرنا ہے۔ دنیا میں اسی دین نے متمکن ہونا ہے۔ ہم ہی اس سے متمتع نہ ہوئے اور ہم نے ہی اپنے نصیب کھوٹے کر لئے تو یہ ہماری اپنی شامتِ اعمال۔ کون ہمارا یار و مددگار رہ سکتا ہے؟

محترم پرویز صاحب کے ذاتی معالج ــــ **ڈاکٹر صلاح الدین اکبر**

کی ــــ **تین مشہور کتابیں** ــــ

۱۔ البم اور سائے۔ قیمت -/۲۴ روپے، (۲) ناگفتہ بہ۔ قیمت -/۴۰ روپے، (۳) انسان۔ قیمت -/۴۵

طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵/بی گلبرگ سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

حقائق و عبر

۱۔ شریعت بل اور علماء

شریعت بل کے بارے میں ایک ہی فرقے کے مختلف علماء نے جو طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے۔ اس کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے ہفت روزہ چٹان نے یہ تبصرہ کیا ہے۔ کہ شریعت بل کا خواب کثرتِ تعبیر سے پریشان ہو چکا ہے۔ اور بعض علماء جو اس سلسلے میں حکومت کو الٹی میٹم دے رہے ہیں۔ اس کی حقیقت کیا ہے: ملاحظہ فرمائیے:

"شریعت بل منوانے کی غرض سے قائم ہونے والے متحدہ شریعت محاذ نے پشاور کے بہت بڑے جلسہ عام میں حکومت کو الٹی میٹم دیا ہے۔ کہ وہ ۲۷ رمضان المبارک تک اس بل کو منظور کرے ورنہ اس کے خلاف راست اقدام کیا جائے گا، شریعت محاذ میں اگرچہ چاروں مکاتب فکر کے لوگ ہیں اور جلسہ بھی بہت بڑا ہوا مگر اس الٹی میٹم کی حیثیت محلِ نظر ہے، کیونکہ زعماء اور اکابر میں یک جہتی اور ہم آہنگی کا فقدان ہے۔ ع

شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیر

شریعت بل سینٹ میں جمیعت علماء اسلام (درخواستی گروپ) کے مرکزی سیکرٹری جنرل مولانا سمیع الحق نے پیش کیا ہوا ہے۔ اور جمیعت علماء اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) اس بل کا اتنا ہی مخالف ہے، جتنا وہ مسلم لیگی حکومت کا!

اہل حدیثوں میں سے مولانا عبدالقادر روپڑی اور ان کے ہمنوا متحدہ شریعت محاذ میں شامل ہیں اور مولانا احسان الٰہی ظہیر کی جمیعت اہل حدیث اس پوری تحریک کو منافقت قرار دیتی ہے۔ بریلویوں میں مفتی محمد حسین نعیمی شریعت محاذ کے سنیئر نائب صدر ہیں۔ اور مولانا مفتی عبدالقیوم ہزاروی اور ان کے رفقاء اس تحریک کے پرجوش حامی، مگر مولانا شاہ احمد نورانی شریعت محاذ کے سخت ناقد اور مخالف ہیں۔ البتہ جماعت اسلامی من حیث الجماعت اس کی حامی ہے۔

فضل الرحمٰن گروپ اس تحریک کو حکومت کی ایک چال سمجھتا ہے۔ اور اس کے نزدیک شریعت

قائم کرنے کے مقابلے میں حکومت کو ہٹانا زیادہ اہم ہے۔ مولانا احسان الٰہی ظہیر کو شکوہ تھا کہ اس بل کی منظوری سے اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔ مولانا شاہ احمد نورانی اور ان کی جماعت اہلِ سنت کا کہنا ہے۔ کہ شریعت بل مبہم ہے۔ اس میں یہ واضح نہیں کہ کون سی فقہ نافذ کی جائے گی۔ جب کہ فقہ حنفی کی مفصل دستاویز فتاویٰ عالم گیری موجود ہے۔ تو پھر نئے بل کی کیا ضرورت ہے! اسے من وعن نافذ کر دیا جائے۔

(ہفت روزہ چٹان بابت ۲۰ اپریل ۱۹۸۷ء ص ۱۴، ۱۵)

۲۔ فرقہ اہل حدیث اور غائبانہ نمازِ جنازہ

ان دنوں فرقہ اہل حدیث کی جانب سے اپنے ایک سیاسی اور مذہبی لیڈر جناب احسان الٰہی ظہیر کی وفات پر، ہر شہر میں غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کی جا رہی ہے۔ اس نماز میں کہیں کہیں حنفی علماء بھی شریک ہو رہے ہیں لیکن آج سے ٹھیک ۳۹ سال پہلے جب حضرت قائدِ اعظمؒ نے وفات پائی۔ اور اہل پاکستان نے اپنے قائد سے محبت کی وجہ سے ان کی غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کی۔ تو علماء کی جانب سے شور مچایا گیا کہ غائبانہ نمازِ جنازہ حنفی فقہ میں ناجائز ہے۔ اہل حدیث علماء نے اسے بدعتِ سیئہ قرار دیا، اور اس کی تائید میں، انہوں نے حضرت امام ابن تیمیہؒ کے مندرجہ ذیل فتوی کا حوالہ دیا:۔

"نمازِ جنازہ کے وقت میت کا سامنے موجود ہونا لازمی ہے۔ تاہم اگر کوئی ایسی صورت ہو کہ میت شہر کی فصیل سے باہر ہو اور اندر نہ لائی جا سکتی ہو، تو اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھائی جا سکتی ہے۔ لیکن کسی دوسرے ایسے شہر کی میت، کہ جس کی طرف جانا سفر شمار ہوتا ہو، وہاں کی میت کی غائبانہ نمازِ جنازہ ادا نہیں ہو سکتی۔"

(الفتاویٰ الکبریٰ از امام ابن تیمیہ جلد چہارم ص ۴۴۴)

(بحوالہ روزنامہ پاکستان ٹائمز ۷ مئی ۱۹۸۷ء۔ ص ۳)

خیال رہے، کہ اہل حدیث علماء کے نزدیک امام ابنِ تیمیہؒ کا وہی مقام ہے۔ جو حنفیوں کے نزدیک امام ابو حنیفہؒ کا۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ جو چیز حضرت قائدِ اعظمؒ کے لیے ناجائز اور بدعتِ سیئہ تھی۔ اب اہل حدیث کے اپنے لیڈر کے لیے خاص اسلامی ہو گئی ہے۔ اسلامی احکامات کے بارے میں علماء حضرات کی اس قسم کی دوعملی کی وجہ سے عوام کے دلوں سے ان کی عزت ختم ہو گئی ہے۔ ہم نے پچھلے دو ماہ میں شائع ہونے

والے اہل حدیث فرقوں کے تمام اخبارات و رسائل کا مطالعہ کیا ہے۔ لیکن مسلکِ حق کا دعوے کرنے والے اس فرقے کے کسی عالم دین نے اب بھول کر بھی اپنے امام ابن تیمیہ کے فتوے کا حوالہ نہیں دیا۔

۳۔ جماعت اسلامی کی نئی معاشی پالیسی

جماعت اسلامی نے ابھی حال ہی میں اپنی نئی معاشی پالیسی کا اعلان کیا ہے۔ جو خود ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے۔

ہماری معاشی پالیسی کے بنیادی مقاصد یہ ہیں۔

- عادلانہ تقسیم دولت۔
- دولت کو چند ہاتھوں میں مرکوز ہونے سے روکنا۔
- ظلم اور ناجائز استحصال کی تمام صورتوں کا خاتمہ۔
- تمام لوگوں کے لیے مساوی مواقع کی فراہمی۔
- معاشی ترقی کے فوائد سے ملک کے تمام لوگوں کو مستفید ہونے کا موقع دینا۔
- ملک سے غربت کا خاتمہ اور اس امر کی ضمانت کہ بنیادی ضروریاتِ زندگی سے کوئی باشندہ محروم نہ رہے۔
- ملک میں غلط قوانین اور انتظامی پالیسیوں کی وجہ سے دولت کا جو بے تحاشا ارتکاز پیدا ہوتا ہے اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کو روکنے اور مرتکز شدہ دولت کو پھیلانے کے لیے حسب ذیل تدابیر اختیار کی جائیں گی۔

I سود، سٹہ، جواء، بیوع فاسدہ، ناجائز ذخیرہ اندوزی اور کسب مال کے دوسرے تمام ان طریقوں کو قانوناً منسوخ کر دیا جائے گا۔ جنہیں اسلامی شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ اور دولت حاصل کرنے کے صرف حلال طریقے باقی رہنے دیئے جائیں گے۔

II اب تک ناجائز اور حرام طریقوں اور ایک فاسد نظام کی غلط بخشیوں سے دولت کا جو انتہائی ظالمانہ ارتکاز ہو چکا ہے۔ اس کا استیصال کرنے کے لیے اسلامی اصولوں کے مطابق تمام ان لوگوں کا سختی سے محاسبہ کیا جائے گا۔ جن کے پاس دولت کا غیر معمولی اجتماع پایا جاتا ہے۔ اور اس حرام دولت کو واپس لینے کے لیے تمام مناسب انتظامی اور قانونی تدابیر اختیار کی جائیں گی۔

- ملک کی صنعتی ترقی کے لیے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ جلدی سے جلدی بھاری صنعتوں (ہیوی انڈسٹریز) کا قیام عمل میں لایا جائے۔
- ملکی دفاع کے لیے اسلحہ سازی کی صنعت کو بھی زیادہ سے زیادہ ترقی دینا ہمارے نزدیک ضروری ہے۔

(ہفت روزہ ایشیاء بابت ۱۶ اپریل ۱۹۸۷ صـ۱۶)

۱۹۷۷ء میں جب جماعت اسلامی قومی اتحاد میں شامل ہوئی تھی۔ تو اس نے اپنی معاشی پالیسی کی ایک اہم شق یہ بتائی تھی۔ کہ غیر حاضر زمینداری کا نظام (یعنی بٹائی پر زمین دینا) خلافِ اسلام ہے۔ اور وہ برسرِ اقتدار آکر اسے ختم کر کے زمین اسی کے حوالے کریں گے۔ جو اس پر کام کرے گا۔ (انتخابی منشور پاکستان قومی اتحاد صـ۱۶) لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اب غیر حاضر زمینداروں سے اس کی افہام و تفہیم ہو چکی ہے اور جو معاشی معاملہ ۱۹۷۷ء میں غیر اسلامی تھا۔ اب اسلامی ہو چکا ہے۔ اس لئے اسے جماعت کی معاشی پالیسی میں شامل کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ یہ ہے جماعت اسلامی کی جانب سے نظام اسلام قائم کرنے کی ایک جھلک۔

۴۔ مساجد اور علماء

اسلام میں مساجد کا مقام کیا ہے اور علماء نے ان کا کیا حشر کیا ہے۔ اس سلسلے میں ماہنامہ اشراق کے ایڈیٹر جناب جاوید احمد الغامدی صاحب لکھتے ہیں:۔

"ہمارے معاشرے پر اثر انداز ہونے والے عوامل میں مساجد کی اہمیت بھی غیر معمولی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سنت ان کے بارے میں قائم کی، وہ یہ تھی کہ ان میں نمازِ جمعہ کا خطاب اور اس کی امامت امیرِ ریاست اور اس کے عمال ہی کریں گے۔ ان کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اگر کسی حجتِ شرعی کی بنا پر ان کی معذوری کی صورت میں اس مقصد کے لیے منبر پر کھڑا ہوگا تو ان کی اجازت سے اور ان کے قائم مقام ہی کی حیثیت سے کھڑا ہوگا۔

یہ درحقیقت خدا کے آخری پیغمبر کی طرف سے اس بات کا اعلان تھا کہ اس دین میں مسجد ہی ایوانِ اقتدار ہے۔ یہاں کوئی پوپ ہے نہ برہمن۔ مسلمان جسے اپنی سیاست کا امام بنائیں گے، اُن کی عبادت کا امام بھی وہی ہوگا۔ مذہب و سیاست کی ہر تفریق اب ہمیشہ کے لیے ختم کر دی گئی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو خلافت آپ کے صحابہ نے قائم کی، اس میں یہ سنّت پوری شان کے ساتھ قائم رہی۔ لیکن بعد کے زمانوں میں جب حکمران اپنے اعمال کی وجہ سے لوگوں کے روبرو کھڑے ہونے کے قابل نہ رہے تو مسجد کا منبر خود انہوں نے علماء کے سپرد کر دیا۔ یہ ہماری تاریخ کا سب سے زیادہ الم انگیز حادثہ ہے۔ اس کے نتیجے میں، اب ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب اپنے جلال اور سیاست اپنے جمال سے محروم ہو گئی ہے۔ وہ جنہیں سرفرازی حاصل ہونی چاہیے تھی، صدیوں سے سرنگوں ہیں اور جنہیں سرنگوں ہونا چاہیے تھا، انہوں نے اس طرح سر اٹھائے ہیں کہ اب انہیں جھکانے کی کوشش کی جائے تو ہزاروں فتنے سر اٹھاتے ہیں۔ مسجدیں مختلف فرقوں کے حصار ہیں، جن میں بیٹھ کر ان کے سرخیل ایک دوسرے پر سنگ باری کرتے ہیں۔ جمعہ کے منبر سے جو ریاست انہیں حاصل ہوئی ہے، اس نے بیشتر مولویوں کا ایسا گروہ ہمارے معاشرے میں پیدا کر دیا ہے، جس کا وجود علماء کے لیے باعثِ ننگ ہے۔ یہ جب کسی کی مخالفت میں زبان کھولتے ہیں تو اس سے کژدم بکھرتے اور اژدر پھنکارتے ہیں۔ دعوتِ حق کا ہر علم بردار ان کے تیروں سے چھلنی ہوتا اور علم و تحقیق ہمیشہ ان کے پتھروں کی زد میں رہتے ہیں۔ ہر مسجد کا دروازہ فرقہ وارانہ ضلالتوں کی تبلیغ کے لیے کھلا اور قرآن و سنّت کی خالص دعوت کے لیے بند ہے۔ کسی صاحبِ علم کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اللہ کے گھر میں بیٹھ کر تعلیم و دعوت کا وہ فرض ادا کر سکے، جو اس کی صلاحیت کے مطابق، بہر حال، اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر عائد ہوتا ہے۔

(ماہنامہ اشراق بابت جنوری ۸۷ ص۴،۵)

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

اکاؤنٹ نمبر 4107-35

جبیب بنک لمیٹڈ مین مارکیٹ برانچ گلبرگ لاہور

احباب نوٹ فرمالیں

کہ ماسوائے رقوم اشتراک مجلّہ طلوعِ اسلام تمام رقوم، ڈرافٹ اور چیک طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کے نام بھیجے جائیں!

مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی

(قرآن حکیم کی روشنی میں ایک جائزہ ایک تجزیہ)

کتاب مذکورہ میں فرقہ بندی کے اسباب ومحرکات اور نتائج وثمرات کو قرآن حکیم کے حوالہ سے جس انداز اور کاوش سے سامنے لایا گیا ہے اس کا مطالعہ خصوصاً نئی نسل کے لیے ناگزیر ہے۔

یہ کتاب مندرجہ ذیل ۱۸ ابواب پر مشتمل ہے۔

" قرآن کریم کی عظمت، مقام فقہ، کتاب وسنت، مقام حدیث، قرأت کا اختلاف، نسخ ومنسوخ، اسلامی آیین کی تدوین اور علمائے کرام، علماء کی علمی سطح دانشوروں کی نظر میں، مذہب اور دین میں فرق، ہماری مساجد، تصوف، ہماری تاریخ، عورت کی حالت زار، قرآن کا معاشی نظام، تعلیم، علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کی رفاقت اور اس کے بعد تقریباً ۳۰۰ صفحات پر مشتمل —

سیاسی فرقہ بندی کی دلخراش داستان

— جس میں تحریک پاکستان سے لے کر آج تک کے حالات کو زیر بحث لایا گیا ہے!

تالیف : **محمد اشرف ظفر**

ملنے کے پتے : ۱۔ محمد اشرف ظفر۔ پوسٹ بکس نمبر ۸۰۳۹ - لاہور ۱۵

۲۔ ندیم بک ہاؤس - جی - پی - او بکس ۱۳۳۱ - پرانی انار کلی لاہور

۳۔ کلاسیک - ۴۲ - دی مال، لاہور

۴۔ طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) - ۲۵ - بی، گلبرگ ۲ - لاہور

ثریا عندلیب

قرآنی اقدار و قوانین اور ہماری عملی زندگی

(طلوع اسلام کنونشن ۱۹۸۷ء میں پیش کیا گیا مقالہ)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ ہم مسلمان ہیں! یہ وہ فقرہ ہے جو ہم اکثر و بیشتر ایک دوسرے سے کہتے رہتے ہیں۔ اور عام طور پر ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ چونکہ ہم اللہ، اس کے رسولؐ اور اس کی آخری کتاب قرآن حکیم کو مانتے ہیں۔ ہمارا ان پر ایمان ہے۔ اس لیے ہمیں اپنی دنیا اور آخرت کی طرف سے فکرمند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ مسلمان ہونے کے ناطے ہم بخشے بخشائے ہیں۔ یہ تو ہوا وہ عقیدہ جو روایتی طور پر ہمارے ہاں صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ یا پھر یہ وہ مفروضہ ہے جو ہم نے خود فریبی میں مبتلا رہتے ہوئے اپنی نجات کے لیے گھڑ رکھا ہے۔ لیکن جس کتاب مبین پر بزعم خویش ہمارا ایمان ہے وہ جن حقائق و ضوابط کی حامل ہے۔ ان سے ہم اپنا کوئی تعلق سمجھتے ہیں، نہ ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم کی مستقل اقدار اور اٹل قوانین کا جو براہ راست تعلق ہماری انفرادی و اجتماعی عملی زندگی سے ہے اور جنہیں اختیار کرنے کا ہمیں ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے، اس طرف ہمارا دھیان کیسے جائے، جبکہ قرآن پر ہمارے ایمان کا مطالبہ تو اتنا ہی ہے کہ ہم اس کے الفاظ پڑھتے رہیں۔ زبان سے انہیں دہراتے رہیں۔ وظیفوں کی صورت میں آیات قرآنی کا ورد کرتے رہیں۔ یوں ہم پکے اور سچے مسلمان بن جاتے ہیں۔ جب ہمارے سامنے تلاوت قرآن کا مفہوم صرف قرآن پڑھ لینا ہو اور اسکے پڑھنے سے ثواب بھی بے حد و حساب ملتا ہو تو پھر ہمارے کرنے کو کیا رہ جاتا ہے۔ قرآن پڑھنا تو ایک طرف ہمیں تو یہاں تک رعایت حاصل ہے۔ کہ قرآن کریم کے الفاظ پر صرف انگلی پھیر لینا بھی ہمیں ثواب کا حق دار بنا دیتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تلاوت قرآن جماعت مومنین کا اولین و آخرین فریضہ ہے۔ لیکن تلاوت کہتے کسے ہیں۔ اس کا بھی تو علم ہونا چاہیے۔ عربی زبان کے اس لفظ جس کا استعمال قرآن کریم میں متعدد مقامات پر ہوا ہے کے معنی ہیں پیچھے پیچھے چلنا۔ اس اعتبار سے تلاوتِ قرآن کا مطلب ہے احکام خداوندی کی پیروی کرنا۔ قوانین خداوندی کا پابند رہنا۔ ظاہر ہے کہ قرآن نے جو غیر متبدل احکامات

دیئے ہیں اور مستقل اقدار و قوانین کی پابندی لازمی ٹھہرائی ہے انہیں سمجھے اور جانے بغیر تو اُن کے مطابق اپنی عملی زندگی کو ڈھالا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ قرآن ہی کے فرمان کے مطابق قرآن پڑھنے کا مقصود یہ ہے کہ اسے پڑھ کر سمجھا جائے اور سمجھنے کے بعد عملی طور پر اسے ضابطۂ حیات بنایا جائے۔ جہاں تک قرآن حکیم کو ضابطہ حیات انسانی تسلیم کرنے کا تعلق ہے تو یہ محض زبان سے کہہ دینے کی بات نہیں۔ اس کے لئے تو ہمیں اپنے روزمرہ اعمال سے اس کی بین شہادت دینا ہوتی ہے۔ تو آیئے ذرا اس کا مختصراً جائزہ لیں کہ قرآنی اقدار و قوانین اور اصول و ضوابط کا ہماری روزمرّہ زندگی میں کتنا عمل دخل ہے۔

دیکھیئے! تکریم آدمیت قرآن کریم کی بنیادی اور افضل قدر ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ ۱۷/۷۰ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو محض انسان ہونے کی وجہ سے عزت و احترام کا مستحق قرار دیا ہے۔ سوال یہ ہے کیا ہم واقعی اس ارشاد ربانی پر ایمان رکھتے ہیں اور عملاً بھی ایسا کرتے ہیں۔ کیا ہم ہر انسان کو بطور انسان عزت کا حق دار سمجھتے ہیں یا ظاہری طور پر اپنے سے کم تر نظر آنے والے انسان کی طرف سے منہ پھیر کر چل دیتے ہیں۔ کیا مجموعی طور پر ہم افراد معاشرہ نے یہی انسانیت کش طریقہ نہیں اپنا رکھا؟ اخوت کو لیجیے۔ جو ایک انسانیت ساز قدر ہے۔ جس کے متعلق قرآن کہتا ہے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ۴۹/۱۰ یعنی یہ بات یقینی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام مومن بندوں کے درمیان اخوت کا رشتہ قائم کیا ہے۔ سب مومن ایک آئیڈیالوجی ایک نصب العین قرآنی رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے بہن بھائی ہیں۔ اخوت کے اسی رشتے سے وہ عالمگیر اجتماعیت وجود میں آتی ہے جو مقصود و مطلوب اسلام ہے۔ اور جو قرآن کی ایک اور عظیم قدر كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۲/۲۱۳ کے تحت کل نوع انسانی کو ایک امت میں تبدیل کرنے کا ذریعہ ہے۔ لیکن اخوت کے حوالے سے ہم مسلمانوں کی کیفیت کیا ہے۔ ہم نے اپنی عملی زندگی میں اخوت کو کیا سمجھ رکھا ہے۔ یہی نا کہ بہن بھائی تو بس اپنے ماں جائے ہوتے ہیں یا پھر اپنے خاندان کے لوگ تھوڑا سا اور آگے بڑھے تو اپنے دوستوں کو اس شق میں جگہ دے دی اللہ اللہ خیر سلاّ۔ قرآن کے فرمان کے مطابق دنیا کے تمام مسلمانوں کو اپنے بہن بھائی تصور کرنا تو ایک طرف رہا۔ ہمارے یہاں صرف اپنے ہی معاشرے کے سب مسلمان کیا ایک دوسرے کے اخوان ہیں؟ ایسا نہیں ہے۔ اخوت کا ہماری عملی زندگی سے وہ تعلق نہیں جس کا مطالبہ قرآن کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھرے معاشرے میں ہر فرد خود کو تنہا سمجھتا ہے۔ ایک دوسرے پر اعتماد نہ ہونے اور ایک دوسرے کو پہچان نہ سکنے کی جو بوجھل فضا ہمیں بحیثیت قوم اپنے درمیان نظر آتی ہے اور ہم بے خوف و خطر کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتے تو اس کا بڑا اور بنیادی سبب ہمارا جذبہ اخوت

کو سلائے رکھنا ہے۔ ورنہ قرآن عزیز کی عطا کردہ اخوت کا حقیقی شعار تو ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان سے کبھی نہ ٹوٹنے والے رشتے میں باندھتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح حق گوئی یعنی سچائی وصداقت وہ اخلاقی صفت ہے جسے کتاب مبین نے اہم اور مستقل قدر کی حیثیت دی ہے اور اس کے تعلق سے بتایا یہ ہے کہ سچ کو صرف ذہنی طور پر اچھا سمجھ لینے اور جھوٹ کو بُرا کہہ دینے سے آدمی سچا نہیں ہو جاتا بلکہ دل اور زبان کی موافقت کے ساتھ کسی بات کے واقعہ کے مطابق ہونے کو ماننے اور بتانے کا نام سچائی ہے۔ اور حق گو صداقت شعار کہلانے کا مستحق وہ شخص ہوتا ہے۔ جس کی نیت۔ جس کی بات۔ جس کا عمل سب حق کی میزان پر پورے اترتے ہوں۔ سچائی اختیار کرنے میں دل کی رضامندی اور دل وزبان کی ہم آہنگی لازمی ہوتی ہے۔ پھر اس سے بڑھ کر ستم ظریفی نہیں ظلم کہیئے، اپنی ہی ذات پر اور کیا ہوگا کہ حق وسچ کو زبانی سراہنے میں تو ہم میں سے ہر کوئی پیش پیش رہتا ہے۔ اور ایک دوسرے کو سچ بولنے کی بڑی تلقین کی جاتی ہے۔ لیکن عملاً جس قدر اس سے گریز کیا جاتا ہے اور جھوٹ کو کہنے اور کرنے کی صورت میں جس طرح اپنایا جاتا ہے۔ اس کا واضح نتیجہ ہم سب کے سامنے ہے۔ زبانی ایمان رکھنے کے بارے میں سورہ عنکبوت میں بتایا گیا ہے کہ جن لوگوں نے قانون خداوندی کی صداقت کا اقرار کیا وہ محض زبانی اقرار سے چھوٹ نہیں گئے۔ انہیں کشمکش حق وباطل کی کٹھالی میں تپایا گیا تاکہ یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے کہ ان میں سے کون اپنے دعوئ ایمان میں سچا ہے۔ اور کون اپنی زبان سے تو دعویٰ کرتا ہے، مگر عمل میں پورا نہیں اترتا۔ ہم نے شاید مہلت کے وقفے کو ابدی سمجھ لیا ہے اور اپنی پیش پا افتادہ مفاد پرستیوں کے طلسم میں کھوئے بیٹھے ہیں۔ ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ چونکہ ہم اللہ رسولؐ کے نام لیوا ہیں اور قرآن مجید سے نسبت بھی رکھتے ہیں اس لئے اللہ ہم سے راضی رہتا ہے اور جنت اس نے ہمارے نام لکھ دی ہے۔ لیکن یہی ہماری سب سے بڑی خود فریبی ہے جو ہمیں اقدار قرآنی سے بیگانہ رکھتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم قرآن کے الفاظ کو ثواب کی خاطر پڑھتے رہتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے یا جاننا نہیں چاہتے کہ اس کتاب ہدایت و ضابطہ حیات کا تو یہ اعلان ہے کہ رب ذوالجلال لوگوں کے خالی دعوئ ایمان کی بناء پر ان کا دوست اور کارساز نہیں ہوتا بلکہ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۶/۱۲۸ وہ ان کے اعمال کی وجہ سے ان کا دوست ہوتا ہے۔ دوسری طرف ایمان بلا عمل، والے لوگوں کی نشان دہی بھی قرآن نے کر دی ہے۔ اس فرمان کے ساتھ کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ ۲/۸ یعنی لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن وہ مومن

نہیں ہوتے۔ اس آیۃ جلیلہ کی روشنی میں ہمیں اپنی طرف نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ ایفائے عہد ایمان کا ایک لازمی جزو ہے۔ قرآن کریم میں ایفائے عہد کی شدت سے تاکید کی گئی ہے کہ اس کے بغیر مسلمان کے ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اور ایفائے عہد کا پابند وہ ہوتا ہے جو دل سے ایمان لاکر جب زبان سے اس کا اقرار کرتا ہے تو عملاً اپنے کہے کی پابندی کرتا ہے۔ اس میں انفرادی طور پر وعدہ کی تکمیل اور اجتماعی طور پر عہد کی پابندی دونوں شامل ہوتے ہیں۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح ایفائے عہد کی ذمہ داری کو ہمارے لئے اہم فرض قرار دیا گیا ہے۔ مگر ہم نے اس طرف سے یکسر غفلت اختیار کر رکھی ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ اس کی کتاب پر ایمان کا عہد و پیمان باندھے رکھنے کے ہم دعویدار تو ہیں لیکن اس کے عملی تقاضوں کی طرف دھیان دینا ہمارا شیوہ نہیں۔ قرآن کہتا ہے۔ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۶۱/۲ تم وہ کچھ کہتے کیوں ہو جو تم کرتے نہیں۔ ہم اس قرآنی تنبیہ کو سنتے بھی ہیں۔ پڑھتے بھی ہیں۔ یوں سننے اور پڑھنے کا ثواب تو ہمیں مل ہی جاتا ہے۔ اس کے بعد اپنے کہے اور کرنے میں مطابقت کرنا تو ہمارا ذاتی فعل ٹھہرا۔ جس طرح ہماری ضرورت ہوتی ہے اسی طرح ہم کر لیتے ہیں۔ یہی وہ باطل تصورِ حیات ہے۔ جس نے وعدہ خلافی اور عہد شکنی کو ہمارے معاشرے کا مزاج اور دستور بنا رکھا ہے۔ ہماری شب و روز کی زندگی کا عام رویہ یہی ہے کہ زبان سے بلا تامل قول دے دو۔ مگر اسے پورا کرنے کی طرف سے بے تعلق ہو جاؤ۔ یعنی وعدہ کرو اور بھول جاؤ۔ شاید اسی لیے شاعرِ بے چارے نے یہ فیصلہ دے دیا تھا کہ ؎

وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا

سورۃ بقرہ میں آیا ہے۔ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۲/۱۸۸۔ اس آیت کریمہ میں کہا گیا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق پر نہ کھاؤ یا اگر معاملہ عدالت تک جا پہنچے تو ایسا نہ کرو۔ کہ حکام کو رشوت دے کر ایسا فیصلہ لے لو جس سے دوسروں کا کچھ مال ناجائز طور پر تمہیں مل جائے جبکہ تم جانتے ہو کہ جو مال اس طرح حاصل کیا جائے اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔

اس حکم خداوندی اور اصول قرآنی کے باوجود ہمارے ہاں بدترین و سنگین جرم رشوت کے فروغ کا جو عالم ہے۔ اُسے کون نہیں جانتا۔ درآنحالیکہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ اس کے خلاف کہتا اور اس کی برائی کرتا نظر آتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ رشوت کے کاروبار کا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔ وجہ تو وہی ایک ہے جو قرآن نے بیان کر دی ہے۔ مگر کوئی دھیان دے تو۔ جو کہو وہ کرو نہیں یہ ہے وہ بنیاد جس پر ہوا و ہوس کے بندے مفاد پرستیوں کے فریب نظر قصر ایستادہ کرتے ہیں اور انسان اپنے بلند مقام سے پستیوں

نہیں ہوتے۔ اس آیۃ جلیلہ کی روشنی میں ہمیں اپنی طرف نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ ایفائے عہد ایمان کا ایک لازمی جزو ہے۔ قرآن کریم میں ایفائے عہد کی شدت سے تاکید کی گئی ہے کہ اس کے بغیر مسلمان کے ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اور ایفائے عہد کا پابند وہ ہوتا ہے جو دل سے ایمان لاکر جب زبان سے اس کا اقرار کرتا ہے تو عملاً اپنے کہے کی پابندی کرتا ہے۔ اس میں انفرادی طور پر وعدہ کی تکمیل اور اجتماعی طور پر عہد کی پابندی دونوں شامل ہوتے ہیں۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح ایفائے عہد کی ذمہ داری کو ہمارے لئے اہم فرض قرار دیا گیا ہے۔ مگر ہم نے اس طرف سے یکسر غفلت اختیار کر رکھی ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ اس کی کتاب پر ایمان کا عہد و پیمان باندھے رکھنے کے ہم دعویدار تو ہیں لیکن اس کے عملی تقاضوں کی طرف دھیان دینا ہمارا شیوہ نہیں۔ قرآن کہتا ہے۔ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۶۱/۲ تم وہ کچھ کہتے کیوں ہو جو تم کرتے نہیں۔ ہم اس قرآنی تنبیہ کو سنتے بھی ہیں۔ پڑھتے بھی ہیں۔ یوں سننے اور پڑھنے کا ثواب تو ہمیں مل ہی جاتا ہے۔ اس کے بعد اپنے کہے اور کرنے میں مطابقت کرنا تو ہمارا ذاتی فعل ٹھہرا۔ جس طرح ہماری ضرورت ہوتی ہے اسی طرح ہم کر لیتے ہیں۔ یہی وہ باطل تصورِ حیات ہے۔ جس نے وعدہ خلافی اور عہد شکنی کو ہمارے معاشرے کا مزاج اور دستور بنا رکھا ہے۔ ہماری شب و روز کی زندگی کا عام رویہ یہی ہے کہ زبان سے بلا تامل قول دے دو۔ مگر اسے پورا کرنے کی طرف سے بے تعلق ہو جاؤ۔ یعنی وعدہ کرو اور بھول جاؤ۔ شاید اسی لیے شاعرِ بے چارے نے یہ فیصلہ دے دیا تھا کہ ؎

وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا

سورۃ بقرہ میں آیا ہے۔ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۲/۱۸۸۔ اس آیت کریمہ میں کہا گیا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق پر نہ کھاؤ یا اگر معاملہ عدالت تک جا پہنچے تو ایسا نہ کرو۔ کہ حکام کو رشوت دے کر ایسا فیصلہ لے لو جس سے دوسروں کا کچھ مال ناجائز طور پر تمہیں مل جائے جبکہ تم جانتے ہو کہ جو مال اس طرح حاصل کیا جائے اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔

اس حکم خداوندی اور اصول قرآنی کے باوجود ہمارے ہاں بدترین و سنگین جرم رشوت کے فروغ کا جو عالم ہے۔ اُسے کون نہیں جانتا۔ درآنحالیکہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ اس کے خلاف کہتا اور اس کی برائی کرتا نظر آتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ رشوت کے کاروبار کا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔ وجہ تو وہی ایک ہے جو قرآن نے بیان کر دی ہے۔ مگر کوئی دھیان دے تو۔ جو کہو وہ کرو نہیں یہ ہے وہ بنیاد جس پر ہوا و ہوس کے بندے مفاد پرستیوں کے فریب نظر قصر ایستادہ کرتے ہیں اور انسان اپنے بلند مقام سے پستیوں

تھے۔ ان کو آج بھی جوں کا توں قبول کرنا ہوگا۔ ان میں غور و فکر نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ فقہ کے معنی ہی غور و فکر کرنے کے ہیں۔ لیکن جب فقہ میں ہی غور و فکر کرنے کی بندش لگا دی جائے تو پھر اے خدا! تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سہل انگار اقوام قوتِ عمل سے محروم ہو جاتی ہیں تو وہ اندھی تقلید میں ہی اپنی عافیت سمجھتی ہیں۔ محترم حاضرین! مجھے افسوس ہے کہ اس جائزے میں تلخ حقائق ہی نمایاں ہیں۔ اور وہ اس لئے کہ من حیث القوم ہم نے جو روش زندگی اختیار کر رکھی ہے وہ حقیقتاً یہی ہے کہ ہمارے اعمال و اطوار کا قرآنی قوانین و اقدار سے کوئی واسطہ تعلق نہیں۔ یہاں یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس کھلی گمراہی کا علاج کیا ہو؟ ہمارے ضابطۂ حیات نے ہمیں اس سے بھی محروم نہیں رکھا۔ اس نے مکافاتِ عمل کا جو محکم اور اٹل قانون دے رکھا ہے۔ اس پر دل کی پوری رضامندی کے ساتھ یقین و ایمان رکھنا ہماری دنیا بدل سکتا ہے۔

اس قانون کے معنی یہ ہیں کہ انسان کا ہر عمل خواہ وہ صحیح ہو یا غلط۔ اس کا ہر ارادہ چاہے وہ نیک ہو یا بد۔ حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والا بُرا یا بھلا خیال بھی ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ یہ عمل جہاں اور جس حالت میں بھی سرزد ہو۔ اس کا نتیجہ از خود کرنے والے کی ذات کو متاثر کرتا اور کرتا رہتا ہے اور اس قانون الٰہی پر ایمان رکھنے والے کو اس امر سے بے خبر نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اپنے ہر عمل کے لیے جواب دہ ہے اور اس جواب دہی کا سلسلہ دنیوی زندگی سے شروع ہو کر اخروی زندگی پر محیط ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر ہر کام شروع کرتے وقت قانون مکافاتِ عمل ہمارے پیش نظر ہو تو ہم کیونکر کوئی غلط قدم اٹھا سکتے ہیں۔ ہم جو قرآن پر ایمان رکھنے کے مدعی ہیں۔ اس کے قانون کے تحت خود احتسابی کے عمل سے غافل ہو سکتے ہیں۔ نہ دامن بچا سکتے ہیں۔ مکافاتِ عمل کے احساس ہی سے تو محاسبہ خویش کا عمل ظہور میں آتا ہے۔ اور خود احتسابی کرنے والے مسلمان کے سامنے یہ ہدایت خداوندی ہوتی ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ۱۱/۱۱۴ یعنی یہ بات یقینی ہے کہ غلط کاموں کے تخریبی نتائج کی تلافی اچھے کام کرنے سے ہوتی ہے۔ جواب دہی کا احساس انسان کی اس غلط نگہی اور خود فریبی کو دور کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ ارتکاب جرم کرتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔ اَیَحْسَبُ اَنْ لَّمْ یَرَهٗۤ اَحَدٌ ۹۰/۵ یعنی انسان سمجھتا ہے کہ مجھے کوئی دیکھ نہیں رہا۔ جبکہ ایسا نہیں۔ اللہ اسے اُس وقت بھی دیکھ رہا ہوتا ہے جب کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۲/۲۶۵ وہ تو دل میں چھپے ہوئے رازوں اور نگاہ کی خیانتوں سے بھی واقف ہوتا ہے۔ یَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ ۔ ۴۰/۱۹ جواب دہی کی اسی ذمہ داری کو قرآن نے دوسری جگہ تَابَ وَاَصْلَحَ ۶/۵۴

سے متعلق کیا ہے۔ اپنی غلطی محسوس کر کے واپس پلٹنا اور دوراہے پر پہنچنا تَابَ یعنی توبہ ہے۔ اس
کے بعد منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے صحیح راستے پر چلنا ناگزیر ہوتا ہے۔ اسے قرآن نے اَصْلَحَ
بتایا ہے۔ اور ہر جگہ تَابَ کے ساتھ اَصْلَحَ کو لازم ٹھہرایا ہے۔ ہمارے سامنے سورۃ بقرۃ کی یہ آیت
آتی ہے۔ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَیَّنُوْا فَاُولٰٓئِکَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ
یعنی غلط اقدام کے نقصان سے وہی لوگ بچ سکتے ہیں جو غلط راستے سے واپس لوٹیں۔ پھر صلاحیت
بخش کام کریں۔ اور اس طرح واضح کر دیں کہ وہ پھر غلط روش پر نہیں چلیں گے۔ انہی کی طرف خدا کا قانون
مکافات پلٹ کر آجاتا ہے۔ وہ تَوَّابُ الرَّحِیْمُ ہے۔ جو شخص غلط سمت سے مڑ کر صحیح سمت کی طرف قدم
اٹھائے اسے منزل مقصود تک پہنچا دینے والا۔ یہ اس کی رحمت بے پایاں ہے۔ مگر یاد رکھیئے اقدام اوّل
ہمیں اٹھانا ہوگا اور اپنی عملی زندگی کو اقدار و قوانین قرآنی کے تابع رکھنا ہوگا۔ ہم مسلمان ہوتے
ہوئے وحی خداوندی کے اس نہ مٹنے والے اصول سے کسی طرح بھی لاتعلق نہیں رہ سکتے کہ اِنَّ
اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ [۱۳/۱۱] اللہ کبھی کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا
جب تک وہ قوم خود اپنی حالت کو نہ بدلے۔ آیئے اخوت کے جذبے کے ساتھ مل جل کر اپنی حالت
بدلنے کا عمل اختیار کریں۔

وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَان

والسلام علیکم

بقیہ "نظامِ حکومت" ص۳۱ سے مسلسل

چھپانے اور خوشامد پہ مجبور نہ ہو۔ ہر شخص اپنی رائے کا برملا اظہار کر سکے۔ ووٹوں کا کاروبار نہ ہو سکے
نہ ووٹ خریدے جائیں گے نہ بکیں گے۔ صحیح نمائندے ایوان تک پہنچ سکیں گے۔ وہ اپنے لئے چناؤ کا
بہترین طریقہ خود منتخب کر لیں گے۔ کیونکہ کسی کے نزدیک بھی ذاتی مفاد مقدم نہ ہوگا۔ ہر کوئی اجتماعی مفاد
کو پیش نظر رکھے گا۔ اقتدار منفعت بخش کام نہیں ہوگا پل صراط پہ چلنے والی آزمائش ہوگی۔

بنی اسرائیل کی طرح ویرانوں میں بھٹکے ہوئے ہمیں چالیس سال ہونے کو ہیں، اس سے زیادہ مہلت
اور کیا ملے گی۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

صلاح الدین اکبر